سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ

(۱۰)

دیوانِ طباطبائی

یعنی

صوتِ تغزل

۱۹۳۴ء

مجموعہ کلام

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظمؔ

ناشر

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن

دفعہ اول (۱۰۰۰)

سنہ ۱۹۳۳ء / ۱۳۵۱ھ

قیمت عمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سبحانہ تعالیٰ

ادب الکاتب و الشاعر

غزل

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شعر ایران میں ایجاد ہوئی جس میں مضمون سے پہلے قافیہ و ردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کیا ہیں الٹے سر کے پانسے ہیں چھکا بھی نکل آتا ہے پو بھی نکل آتی ہے۔

یہ وہ لوہیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔

دومیں راہیں جو مضمون کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ نہیں تو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔

غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اس کی قسمت کا جو سہم ہے نکل آتا ہے۔

قافیہ و ردیف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اڑا لاتا ہے۔ ؎

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑا پرتو آئینہ زانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

(لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغ نے یہ شعر نکالا ؎

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھائی ہے
آواز پر ہے شورش محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا ؎

دھوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی دوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ (کا) ردیف ہے اس میں زبان کا مزہ دیکھیے ؎

اٹھنا ہی اسکی بزم سے دشوار تھا مجھے
اور پھر سنبھالیا دل بے اختیار کا

شعر کی ان دونوں صنفوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صنف میں عروض کا ایک وزن ہونا کافی ہے جو قریب قریب موسیقی کا ایک وزن ہوتا ہے قافیہ کا ہونا نہونا زبان کی ساخت پر منحصر ہے۔ اور اس جدید صنف میں وزن بھی قافیہ بھی بلکہ ردیف کا بھی ہونا ضرور ہے معنوی اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ اوس میں تسلسل ضرور ہے اور اس میں قافیہ و ردیف جو رستہ بتائے غزل گو کو اسی طرف جانا چاہیے مثلاً محمل کا قافیہ شاعر کو سجد کی طرف لے گیا اور بسمل نے اوسے مقتل کی طرف کھینچا اس وجہ سے مسلسل غزل میں تسلسل باقی نہ رہا۔ اور تسلسل نہ ہونے سے شعر کی وہ خوبیاں جو بیان کے ساتھ مخصوص ہیں غزل سے فوت ہوگئیں مثلاً (۱) شاہزادہ رخصت مانگ رہا ہے ملکہ سے قلق نے اس مقام کو یوں ادا کیا ہے ؎

منہ سے بولی نہ کچھ وہ غنچہ دہن
پاؤں سے پر دبالیا دامن

یعنی شرم نے منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے کام لیا اور شرم پر غالب آگیا (۲) یا جیسے دو شاہزادے عون و محمدؑ شہادت کے شوق میں نکلے ہیں دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا ہے تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں دونوں کے درمیان حائل ہو گئیں۔ اب بھائی سے بھائی جدا ہو گیا ہے اس مقام پر دونوں کے یکایک مل جانے کو میر انیس یوں فرماتے ہیں ؎

وہ شیر سا پہنچا جو ادھر یہ ادھر آیا
جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آجانے سے ایک کو ایک کی صورت دیکھنے سے یاس ہو گئی تھی (۳) یا مثلاً حر کی آمد میں فرماتے ہیں ؎

برچھیوں اڑتے ہے دب کے فرس ٹاپوں سے
آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے نگہبانوں سے

گھوڑے کا اوڑنا اور دریا کا نظر آجانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حد اعجاز کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں کہ تم نے پانی تو بند کیا ہے اب ہشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔

غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کے

ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنے اور بہت سی باتوں کو ادا کر دے۔ غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعرانہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر

الٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے ادھورا مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے۔ جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے

مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہ کن و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہے غزل گو کہے ہوئے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر

کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہو رہی تھی۔

پہلے شیخ المعتزہ جاحظ نے جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا۔ البیان والتبیین کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آجتک گویا درس میں جاری ہے۔

پھر امام عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغت لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ بلاغ کو بے نقاب کر دیا۔

انھوں نے جو موتی او گلے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے علامہ سکاکی نے گوہر شاہوار چن چن کر ایسی ایسی لڑیاں گوندھیں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔

پھر بھی بعض علمار نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر متن کو زیادہ متین کر دیا۔ اسکی سیکڑوں نقلیں ہوئیں اور بلادِ اسلام میں جابجا درس

ہونے لگے۔

آخر میں فاضل تفتازاں نے بذل جہد کرکے اس متن متین پر شرح میں لکھ ڈالیں اور اسکے فیض کو عام کردیا عرب سے لیکر ہندوستان و سمرقند سے لے کر جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہو گئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے اس سبب سے فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا خاص کر کے فن بیان علما نے اس امر کی تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے کی صورتیں کیا کیا ہیں۔

مثلاً تشبیہ استعارہ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام گوناگوں ہیں

یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا اوسی زمانے میں غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک غزل کے مضامین ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔

یہ سب مضامین عامۃ الورود ہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں مشترک ہے ایک ہی طرح کے ولولے ایک ہی طرح کی امنگیں

ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں مضمون کہاں سے الگ الگ آئیں گے۔ طرز بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو اصل مضمون دوسرا طرز بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے ہاں طرز بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عائد ہوگا۔

طرز بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فن بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حد اعجاز تک پہنچا دیا۔ لکھنؤ کا ایک شاعر زنار بند جس کا سارا کلام زمانے نے شاید تلف کر دیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا یہ چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے کرمفرما نواب عبد الرحمن خاں شاطر نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے ؎

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پہ سوار اے ابلق لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے

اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس طرز ادا کو ترک کر دیا ہوتا

بلکہ بیدل کا یہ شعر ؎

چوں کاغذِ آتش زدہ مہمانِ بقائیم
طاؤس پر افشانِ چمن زار فنائیم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے ؎

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

بیدل نے بے ثباتیِ عمر کے بیان میں کاغذِ آتش زدہ کو طاؤس پر افشاں سے تشبیہ دی ہے۔ غالب نے جوشِ بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام سے اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے۔ دام و شکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ اس زمانے کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کیے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے نہ سمجھیں گے۔

غور سے دیکھیے تو اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے ع

پیداست در آئینہ جوہر چو ذرہ در روزن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ع

پرافشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرّے روزن میں

لیکن ذرّوں کا روزن میں پرافشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں بمستی و ہشیاری آزمود مرا
زبسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا

دیکھئے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابل وجد کرنے کے ہے ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھسے مری ہمت عالی نے مجھے

ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسیر نے بھی بتمثیل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی خیر یہ لوگ تو بڑے مرتبے کے ہیں نواب سیّد محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھیے اور اس شعر کو دیکھیے ؎

میں مسافر ہوں اتر جاؤنگا پار اک دم میں
تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

کرتی ہی بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط   آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکر غزل نہیں چھٹتی اور
تمام اصناف شعر چھوٹ جاتے ہیں۔

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل
نظموں میں اس برجستگی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا نظیری کا یہ شعر لوگوں کے
دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے۔

بوی یار من ازیں سست وفا می آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مرزا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استنباط کیا اور اساتذہ کا کلام
دیکھنے سے یہی استنباط کو مقصود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں ہرگز سرقہ نہیں
یہ مضمون ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے
شوق تھا اور گرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا یہی مضمون ٹینیسن کے یہاں
میں نے اس لباس میں دیکھا کہ "شگوفوں نے بے خودی میں اپنے عطر دانوں
کا عطر لنڈھا دیا"

یہ بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینیسن تک پہنچا تھا

اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک
بند میں کربلا کی سرزمین کا ذکر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

یہ مصرع پڑھ کر مجھ مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس
مصرع کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد دوسرے بند میں بنی فاطمہ کے نونہالوں
کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے بیت یہ ہے ؎

انکی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے
بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

آپ نے دیکھا کس قدر پھیلا کر اس مضمون کو مونس نے کہا کہ انہیں
کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔

بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو سلام
میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں مدح کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولونکو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے
نظیری وسودا و بہار نے دو ہی مصرعوں میں نظم کیا ہے۔

طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے اور

ایسا ہونا بھی چاہئیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۱)

مفاعیلن چار بار

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دمِ قالوا بلےٰ پایا
کیا پائے طلب کو قطع تو دستِ دُعا پایا
خدائی بھر سے ہم نے ہاتھ کھینچا تو خدا پایا
رگِ گردن سے اقرب آسماں کے ماورا پایا
نہ پہچانا کبھی ہم نے اوسے اور بارہا پایا
نفس کو شہر خاموشاں کا ہم نے رہگرا پایا
رہِ بے نقش پا و کاروانِ بے درا پایا
تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے
تری درگاہ سے جتنا ملا اس سے سوا پایا

تعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سی ہے
دل بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا
خدا اگر ہمت عالی بھی دے اور خاکساری بھی
سمجھنا چاہیے بس حاصل ارض و سما پایا
نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا
بہت گر پڑ کے میں نے جادہ صبر و رضا پایا
گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو در سے ساقی کے
اسی کو بزم جم میں ساغر گیتی نما پایا
خوشی کیا سال نو کی غافلو اس دار فانی میں
یہ سوچو تو بھلا اک سال کھویا تم نے یا پایا
بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ سے دیکھا اسے رنگ حنا پایا
جسے ہو دید کی حسرت سنبھلنا اسکا مشکل ہے
کلیم اللہ نے بھی مثل نرگس کے عصا پایا
چلی ہے سل کچھ آزردہ جیسی پر جبیں ہو کر
گدا کے گھر میں کیوں آئی تھی جو اک جیب پا لیا
نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلے والے

نمک افشاں کوئی پایا جبھی تو شور ورا... پایا
زمینِ شعر پہ اے نظم ہم بھی شب کو گزرے تھے
اٹھا لائے میں دامن میں سے جو کچھ پڑا پایا

(۲) (۹)

کلامِ حق ہے توریت اب مجھے یہ اعتبار آیا
خبر موسیٰ نے جس کی دی تھی وہ ناقہ سوار آیا
وہ اس وادی کے گرم و سرد و خشک و تر کو کیا جانے
جو مثلِ باد گزرا اور مانند شرار آیا
مدارِ آسماں کو تنگ سمجھا میری ہمت نے
میں اک قمر کے حلقہ میں عمر اپنی گزار آیا
تعالی اللہ اک دانہ میں یہ تفصیل مضمر تھی
کھلے گل کونپلیں پھوٹیں شگوفے نکلے بار آیا
یہاں جلوے بہت ہیں اور مہلت دو گھڑی کی ہے
ہزار آنکھوں سے میں اس بزم میں مثلِ شرار آیا
جہاں میں چند دن مہماں ہے ہر غنچہ و گلبن
وہ مہماں کیا ہے کہ جو لیا کر مستعار آیا
زنِ دنیا نے گو غازہ کشی کی دل لبھانے کو

مگر اب بھی تو عارض پر نہ رنگ اعتبار آیا
محبت لالہ و گل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پرِ طاوس پر آخر وہی نقش و نگار... آیا
گناہوں سے نہیں مہلت درِ توبہ پہ جانے کی
پکارا کرتی ہے رحمت کوئی اُمیدوار آیا

۳
(۱۵)

جہاں کو مژدہ اس جانِ جہاں کی آمد آمد کا
قیامت مصرعِ ثانی ہے جس کے مصرعِ قد کا
ہُوئے افلاک پیدا نام جب آیا محمّدؐ کا
طلسمِ عالمِ امکاں تھا یارب قفلِ ابجد کا
مواعظ کے گہر عالم میں بکھرائے کو نور اسکا
او بھر آیا ہے غوطہ مار کر دریائے سرمد کا
زباں سے گو نہیں کہتے ہیں تھا انتظار اسکا
گواہی دے رہا ہے دل ہر اک قسیس و موبد کا
کسی میں ہے کہ عالم کا تسلّی دینے والا ہے
کسی انجیل میں لکھا ہوا ہے نام احمدؐ کا

(دو انگلیاں اٹھا کر رسول اللہؐ نے فرمایا تھا انا والساعۃ کہما تین ۱۲
(لغت میں موبد اور موبد دونوں طرح آیا ہے ۱۲)

تری رفتار میں بیشک ہے اعجاز مسیحائی
ہما بن کر فلک پر اڑ گیا سایہ ترے قد کا
براق تیز تگ جب طارم افلاک سے گزرا
تو مثل گرد رنگ اڑنے لگا چرخ زبرجد کا
تجھے معراج کی رفعت ہے فرش خاک پر حاصل
سر عرش اعلیٰ تکیہ ہے تیری مسند کا
جبھی سے عالم اسرار علم کن فکاں ہے تو
سبق روح القدس مکتب میں جب پڑھتے تھے ابجد کا
دعا مقبول ہو جاتی ہے تیرا نام لینے سے
ملا بندوں کو موقع حق تعالیٰ کی خوشامد کا
ملا اللہ اکبر کیا صلہ تیرے نواسوں کو
کہ ان کا قصر ہے یاقوت کا ان کا زمرد کا
میسر فرش تا عرش اک قدم مرکب کا ہے تیرے
مقام قاب قوسین ایک گوشہ تیری مسند کا
تعالیٰ اللہ ہے اس شاہ کی شان کرم ایسی[1]
بھرم کھلنے نہیں پاتا منافق کی خوشامد کا

[1] رسول اللہ منافقوں میں گھیرے ہوئے تھے اور سب سے مدارا کرتے تھے ۱۲

نہ چھوڑے گا درِ حیدر کو اب نظم ثنا گستر
یہی در ہے رسول اللہ کے شہر علم بے حد کا
کہاں ہے کعب سیکھے ہم سے آئین ثنا خوانی
کہ نعت مصطفیٰ اور ذکر شمشیر مہند کا

(۱۴)

نظر آتا ہے ابر آسا گزرنا کوہساروں کا
کہ عالم عالم اجسام میں ہے بے قراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے
کلیجا ہاتھ بھر کا ہو گیا امیدواروں کا
گلستاں ہو کہ خارستاں ہو دونوں جائے عبرت ہیں
یہ مقتل نیزہ بازوں کا وہ مقتل تاجداروں کا
نہیں ہے شرک سجدہ کی جہت مشرق ہو یا مغرب
سمجھتا ہو اگر تو ایک عزت سب شماروں کا
کرم ادنی سے ادنی ہے تعالی اللہ
عملوں سے پیشتر نشو و نما ہوتا ہے خاروں کا

۱؎ فتح مکہ کے روز کعب نے جو قصیدہ آنحضرت کے سامنے پڑھا تھا اس میں رسول اللہ کی نسبت سیف من سیوف الہند کہا تھا آنحضرت نے اصلاح دی کہ سیف من سیوف اللہ

نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہی
غبار راہ و نچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا

ضلالت میں پھنسے ہیں اور علائق مانع عزلت
شب تاریک ہے اور کاٹنا ہی کوہساروں کا

بہت جلدی کی تو نے کوس چلنے کے بجا ئیں
کہ میں نے ای اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا

شرار و برق کی فرصت سی کم ہی فرصت ہستی
کہ سیکھا ہے سمند عمر نے پھرنا تراروں کا

ہوا میں ان کے ذرے ہوں تو ہوں جو نامور گزرے
پتہ روئے زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا

بہانہ ڈھونڈھتی ہی اس کی رحمت تو یہ کیا جانے
گنہ ہے گردن مینا یہ واعظ بادہ خواروں کا

کہوں میں کیوں اسے عقد گہر پہنے ہوئے دیکھا
نظر آیا مجھے خورشید پر جھرمٹ ستاروں کا

کھلا ہی ہے کیا سرمہ نگاہ سرمگیں تیری
کہ اف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا

سنجھی ہے کیا اے نظم ہم تو نرقت نصیبوں میں

یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

(۱۹) (۵)

جفا و جور کی حد ہو گئی سمجھیں گے ہم اچھا
ستائے جاؤ تم اچھا کئے جاؤ ستم اچھا
اجل بھی دیکھ کر آفت میں کرجاتی ہے رم اچھا
بھلا کب تک چھپانگی یہ منہ دیکھیں گے ہم اچھا
مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے۔ اٹھنا دم بدم اچھا
دل مضطر کو میرے چھوڑ کر مشق جفا کیسی
یہ کافر تیر کے قابل ہے یا صید حرم اچھا
چھپایا اس نے منزل کو بتایا راستہ اس نے
غبار رہ برا ٹھہرا رہا نقش قدم اچھا
رہے گبر و مسلماں منزل مقصد سے بیگانہ
ملا اس راہ میں ہنگامہ دیر و حرم اچھا
بگڑنا قہر تیرا مہرباں ہونا ہے ایک آفت
یہ انداز کرم اچھا ہے یہ طرز ستم اچھا
نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے مجھ سے

زمانہ بھر سے اچھا اور ترے سر کی قسم اچھا
جواب صاف دیکر توڑنے کیوں ہو مری دل کو
مجھے لیت و لعل اچھی مجھے لا و نعم اچھا
مقام شکر ہے جو کچھ دیا جتنا دیا اس نے
مقدر میں نہیں ہر گز خیال بیش و کم اچھا
نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیس اغنیا ہو کر
کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جام جم اچھا
نفس وزدیدہ جانا خوابگاہوں میں حسینوں کی
نکالا سیر کا وقت اے نسیم صبح دم اچھا
کوئی پوچھے ذرا وارفتگان حسن سے اُس کے
وفا ہے یا جفا اچھی کرم ہے یا ستم اچھا
ورا اندازوں کو سمجھائے کوئی للہ پوچھے تو
ملال آپس کا اچھا مل کے یا رہنا بہم اچھا
مناتا ہے ہر اک اپنی قدح کی خیر عالم میں
سمجھتے ہیں کہ سب سے آپ اچھے اپنا دم اچھا
اگر ایسا ہی پر آشوب ہے ہنگامۂ ہستی
تو پھر شہر خموشاں خوب ہے ملک عدم اچھا

(۱۵)

لحاظ اتنا ابھی تک حضرتِ ناصح کا باقی ہے
وہ جو کچھ حکم فرماتے ہیں کہہ دیتے ہیں ہم اچھا
نہ پایا شعر ہم نے دفتروں میں اور سب کچھ ہے
زباں اچھی مضامیں خوب ہاتھ اچھا قلم اچھا
روانی کو کلامِ نظم کی انصاف سے دیکھیں
تو کھل جائے کہ ہے تلوار اچھی یا قلم اچھا

(۱۶)

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برقِ خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن.. کا
گلستاں میں بھی کیا تم آتش افروزی کو آئے تھے
لگا تا ہے ہوا میں اگ اڑ کر رنگ گلشن کا
جو نازاں ہر دم آزاری پہ ہوا سکو یہ دو مژدہ
اجارہ چیونٹیوں کو مل گیا گورِ تہمتن... کا
جنازہ جس گھڑی پہنچا لبِ مرقد تو ہم سمجھے
ذرا بھی فاصلہ دیکھا نہ گہوارہ سے مدفن کا
نہیں ہے کار فرما ہیچ و راست کا سوا اسکے
مری آنکھوں پہ سر پر شکر و شکوہ دوست دشمن کا

مسیحا و خضر کیا جانیں لذت کو شہادت کی
نہ دیکھی خون کی نادی نہ چشمہ آب آہن کا

نہ پوچھو دل فلک کے حادثہ سے کسطرح ٹوٹا
یہ شیشہ تھا نشانہ ہو گیا سنگ فلاخن کا

یہ کیا باعث کہ لب تک جان آ آ کر پلٹ جائے
اجل بھی کچھ اشارہ پا گئی اس چشم پرفن کا

خبر اس کی نہ تھی یہ بھی خلاف طبع گزرے گا
گلا کاٹا تھا ہم نے دیکھ کر انداز چتون کا

لئے جاتے ہیں کیا کیا حسرتیں ہم کوئے قاتل سے
جنازہ اٹھتے اٹھتے ہو گیا ہے سینکڑوں من کا

وہ دیکھو صف کی صف بسمل ہوئی جسکی لگا ہوئی
کوئی میری طرف منہ پھیرے اس ناوک افگن کا

گریباں میرا تیرا دیکھنا اک ہاتھ میں ہو گا
کہے دیتا ہوں ہیں ناصح مزاج اپنا ہے الجھن کا

کیا تو قید لیکن یاد رکھنا چارہ گر یہ بھی
کہ توڑا ہو گا چوڑی کی طرح سے طوق آہن کا

سنیں ناحق نہ بلبل سے ہیں یہ باتیں مجھسے ناصح نے

ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیث معنعن .. کا
وطن کا حال پوچھا اے نظم تو سیل حوادث سے
ملے بجلی تو پوچھوں میں نشان اپنے نشیمن کا

(۱۲) (۷)

تجمل دیکھ کر تیرے شہیدان محبت کا
مسیحا و خضر پڑھنے لگے کلمہ شہادت کا
مرے دل سے اگر نکلا شرارہ سوز فرقت کا
خدا معلوم ہو کیا حشر خورشید قیامت کا
مسیحا سے مداوا کیا ہو تیرے سوز فرقت کا
رہا مہر درخشاں کو بخار اور کیسی شدت کا
فرشتہ تو نہیں ہے پاکدامن ہو تو کیونکر ہو
کہ دل رکھتا ہے انساں اور دل بھی ایک آفت کا
نہ پوچھو دور گردوں میں حلاوت زندگانی کی
کہ اپنا خون پیتے ہیں مزا لے لے کے شربت کا
سلایا اس نے جب چاہا جگایا اس نے جب چاہا
ہمارے اور اس کے بیچ میں پردہ تھا غفلت کا
ذرا سُن تو سہی کیا شور ہے شہر خموشاں میں

جو عاقل ہیں یہاں آکر سبق لیتے ہیں عبرت کا
شباب اس طرح سے تجزرا کہ اب معلوم ہوتا ہی
وہ باتیں اک زمانہ کی ہیں قصہ ایک مدت کا
فغانِ آبشار و اشکِ ابر و گریۂ شبنم
جدھر دیکھو ادھر رونا ہی اپنی قسمت کا
جو چھپ چھپ کر نہ روؤں رازِ پنہاں رہ نہیں سکتا
کہ میرے آنسوؤں میں رنگ ہی میری طبیعت کا
نہیں ہرگز مجالِ دم زدن آئینہ خانہ میں
ہے اس محفل میں ہنگامہ دو صد آئینہ حیرت کا
دل آزاری کی عالم میں ہوا چلتی ہی اے حیدر
بگولے رقص کرنے میں مٹا کر نقش تربت کا

(۸)

سوا جلوہ کے تیرے اور میرے دل میں کیا ہوتا
سمجھتا اس کو بت خانہ جو نقش ماسوا ہوتا
تجھے یکتا سمجھ کر اے یکتا ہی اٹھاتا ہوں
وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا
کسی کا ذکر کر کے اس قدر لی چٹکیاں تو نے

گل خودرو چمن میں ہنستے ہنستے رو دیا ہوتا
گیا تھا جس نے زانو مسندِ الفقر فخری پر
نہ کیوں نقش سلیماں اس کا نقش بوریا ہوتا
نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبشِ مژگاں کا صدمہ بھی
کہ تو نے آنکھ پھیری میں نظر سے گر گیا ہوتا
وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکا دیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا
مرے باعث سے عالم میں ہوا مشہور تو ورنہ
یہ شہرے ہر جگہ ہوتے یہ چرچا جا بجا ہوتا
تھکا مارا تلاشِ منزلِ مقصد کا ہوں حیدرؔ
قدم پر اس کے سر رکھتا جو کوئی رہنما ہوتا

(۱۷) (۹)

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن تا کمر الٹا
نگاہِ ناز آئینہ میں رکھتی ہے اثر الٹا
ادھر دیکھو قیامت ہو گی یہ جادو اگر الٹا
بہار آئی اٹھے بادل چلے صحرا کو دیوانے

ہوئی الجھن بڑا آزار دل الٹا جگر الٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عیش کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا
موذن نے اذاں مغرب کی دی جب صبح شب فرقت
بجائیں توتیوں نے وردیاں الٹی گجر الٹا
وہ بل کھا کر اٹھے ہیں قتل کرنے کو مرے تا ہو
مجھی پر کچھ نہ کچھ الزام دھر دیگی کمر الٹا
صبا کی شوخیوں پر رشک کیسا مجھکو آتا ہے
کہ آنچل اس کا یوں سوتے میں بےخوف و خطر الٹا
جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زباں کو کس قدر الٹا
وہ آئینہ جو میری آنکھ سے دیکھیں تو بتلا دوں
کلیجہ تھام لیں پلکیں تیر نظر الٹا
کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شب میں
نسیم صبح نے منہ سے مرے دامان تر الٹا
گلی میں اس ستمگر کی نہ جانے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر الٹا

زباں منہ میں حریف کینہ جو کے ہر کہ بچھو ہے
نہ اک سیدھی سی بات اس کی نہ اس کا نیشتر الٹا

بہارِ باغ دونی ہو گئی ہے مینہ برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر الٹا

لبِ دریا تماشا انقلاب دہر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر الٹا

براق اس طرح روز و شب کی حد سے ہو گیا باہر
نظر آنے لگا مہر مبیں سیدھا قمر الٹا

جلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹا اوڑھ کر الٹا

جو ہو سچ بات وہ اے نظم دو پہلو نہیں رکھتی
نظر آتا ہے یکساں رکھیے سیدھا یا کہ الٹا

(١٩) (١٠)

صواب اپنی خطا کو اپنے عیبوں کو ہنر جانا
نہ ہے گم کردہ منزل رہزنوں کو راہ بر جانا

ہمیشہ ہمتِ عالی کو اپنا راہبر جانا
اسی رستے چلا جس راستہ کو پر خطر جانا

گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں او خوف رسوائی
شکست رنگ کے نغمہ کو بھی کیا شور و شر جانا

یہ میری سادگی اے عمر رفتہ میری نادانی
کہ تجھ کو ہم رکاب و ہم عناں و ہم سفر جانا

لیا ہے میں نے ملک خاکساری کو تواضع سے
اسی انداز سے جھکنے کو شمشیر کمر جانا

شعار و رنگ کو سرگم میں سمجھا ساز ہستی کی
تماشائے جہاں کو نغمہ تار نظر جانا

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتی ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید تاج زر جانا

تو اسی آبرو جو قطرہ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جوہر شناسوں نے اسے آب گہر جانا

مصائب بھی جہاں کے دو ثبات ایسے نظر آئے
کہ میں نے آفتاب حشر کو شمع سحر جانا

مجھے وارفتگی پر رشتہ عرفاں کا تھا دھوکا
جسے تجھ بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا

لہ سرگم کے سات سُر جس طرح ساز سے نکلتے ہیں اسی طرح شعار [illegible] رنگت نظر پڑتے ہیں ۱۲

نہ کام آئی ہماری عقل تو کیا تیرے جلوہ کو
بانداز دگر دیکھا بہ عنوان دگر جانا

بنایا رنج و راحت کو جو توام میرے خالق نے
انہیں دو نعمتوں کو میں نے بھی شیر و شکر جانا

خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا
کہ پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھڑ کے چھتے میں
کہ میں نے نوش کو بھی نیش بلکہ نیشتر جانا

دکھائے چاند رخساروں پہ چھلوں نے جو گھونگر کے
منجم نے اسی کو فتنۂ دور قمر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کافور و کفن بھی تھا
اسے رخت سفر سمجھا اسے گرد سفر جانا

جہاں میں اس طرح سے اپنی زیر آسماں گزری
کہ اس کو رہگذر۔ اس کو غبار رہگذر جانا

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی
تبسم برق کا اس کو اسے رقص شرر جانا

مثل ہے نظم جو سویا وہ کھویا حسب حال اپنے

شب فراق آج ہی تھی ہم نے یہ وقت سحر جانا

(۱۱)

ادائیں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے چھو ڈالا
نہ اگلی سی محبت ہے نہ اگلی سی صورت ہے
الٰہی خیر وہ انداز ہی اب تو بدل ڈالا
تمھاری بزم میں آ کر نہ کچھ کہتے بنا ہم سے
گلا نالے نے گھونٹا منہ شکایت نے مسل ڈالا
فلک کو دیکھ کر شکوہ کریں ہم یہ ارادہ تھا
کہا جھک کر فلک نے سر اٹھایا اور کچل ڈالا
جدا ہے پاؤں سے زنجیر تھیر دور ہے سر سے
رفیقان کہن میں تفرقہ خوب اے اجل ڈالا
نہ یہ دیکھا فلک نے کون سرکش کون ہے عاجز
گیہوں کے ساتھ اس نے آسیا میں گھن [illegible] ڈالا
شکن ماتھے پر آئی اب جلا کیوں [illegible]

تعلی بڑھ گئی مو باف جو پہلے پہل ڈالا

موذن کی خوش آہنگی بے ہنگام تو دیکھو
شب عشرت میں ان حضرت نے ناحق کو خلل ڈالا

بنایا غیر کو اس نے نشانہ اپنے پیکاں کا
کسی نے چاہنے والے کا دل چٹکی سے مل ڈالا

علائق میں پھنسایا کیوں جلوہ گاہ قدس سے آکر
بتا اے نظم آخر بھیس کیوں تو نے بدل ڈالا

(۲۰) (۱۲)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

وہ دیکھو روند کر مدفن کسی کا — چھلاوا بن گیا توسن کسی کا
نہ کرنا منہ شکار افگن کسی کا — نہ کھنچا تسمۂ گردن کسی کا
وہ آنا پھیر کر چتون کسی کا — وہ سر پر گوشۂ دامن کسی کا
نگہ ہنگامہ برہم زن کسی کی — تبسم صاعقہ افگن کسی کا
چھری پھیریں گے یہ ابرو کسی کے — کرے گی خون یہ چتون کسی کا
اٹھے اس رہ میں صدہا گرد بن کر — نہ پہونچا ہاتھ تا دامن کسی کا
ستاروں کا بچھونا کہکشاں ہے — گیا ہے لوٹتا دامن کسی کا
کسی کے قصر پر کیوں کھینچئے رشک — سرا ہے یہ نہیں مسکن کسی کا

دیا دو گز کفن گردوں نے بھی — ڈھکا جس سے نہ دو دن تن کسی کا
کوئی ہے کینہ جو اپنے لئے ہے — تجھے کیا تو نہ ہو دشمن کسی کا
نہ پوچھو فاتحہ پڑھنے کا انداز — وہ نازک ہاتھ تھا اور مدفن کسی کا
غبار کاروان بیخودی ہوں — نہ رہبر ہوں نہ میں رہزن کسی کا
چڑھوں میں عرش پر کیوں مل چکا ہے — پتا قرب رگ گردن کسی کا
گنہ کوئی کرے ملزم میں ٹھہروں — کسی سے دل نہ ہو بدظن کسی کا
درازی زلف کی ہے روز افزوں — لہو پیتی ہے یہ ناگن کسی کا
مجھے چاک قبائے گل نے مارا — یونہیں نکلا تھا پیراہن کسی کا
دکھایا میں نے آئینہ تو بولے — ستم ہے آج تو جوبن کسی کا
زوال حسن پر ہے لوچ باقی — ڈھلا سانچے میں ہے جوبن کسی کا
زہے رحمت پسند آئی جو اس کو — ہر سجدہ خم گردن کسی کا

ز خود رفتہ ہی تجلی آج اے نظم
اسے کیا جل گیا خرمن کسی کا

(۱۳) ——— (۱۳)

فعولن فعولن فعولن فعول

بڑے معرکے سے ہے آیا ہوا — لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا
گہر ہے کہ صبح بناگوش میں — ستارہ سا جھلملایا ہوا

وہ عیار نظروں سے اوجھل بھی ہے / پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا
نہ دی پیر تو مجھ سے تو نے نہیں / کہیں ہوں فلک کا ستایا ہوا
سزاوار رحمت ہوں میں اے کریم / کہ آیا ہوں تیرا بلایا ... ہوا
غضب کی تھی میدان محشر میں دھوپ / گناہوں کی ظلمت سے سایا ہوا
نظر جب سے آئی ہے زلف سیاہ / اندھیرا ہے آنکھوں میں چھایا ہوا
جنوں سر پہ جن کی طرح ہے سوار / اجل کی طرح دل ہے آیا ہوا
خوشی میں نے تیری بہر حال کی / خفا مجھ سے اپنا پرایا ہوا
رہائی خودی سے نہ ممکن ہوئی / یہ پہرا ہے کس کا بٹھایا ہوا
چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ / کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا
چھڑکتے ہیں وہ اس ادا سے گلاب / کہ جیتا ہے بے ہوش آیا ہوا

میری نظم کا ہو دلوں پر اثر
یہ سکہ ہے اپنا بٹھایا ہوا

(۱۹) (۱۴)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ایک سے ایک اُس قدر افگن کا احساں بڑھ گیا
تیر سے دل بڑھ گیا پھر دل سے پیکاں بڑھ گیا
لے کے مشتاقوں کو شوقِ بزم جاناں بڑھ گیا

مضطرب سی مضطرب حیراں سے حیراں بڑھ گیا
بڑھتے بڑھتے کس قدر طومار عصیاں بڑھ گیا
چند دفتر قصۂ خواب پریشاں بڑھ گیا
سر ندامت سے جھکانے کا بھی موقع اب نہیں
گھٹنوں گھٹنوں تھا جو پانی تا گریباں بڑھ گیا
کچھ تلاطم میں تھی خود بھی کشتی عمر رواں
دل کے کچھ پیہم دھڑکنے سی بھی طوفاں بڑھ گیا
روز کی بیداد اے چرخ اور اک عالم کی آہ
دیکھنا اک دن چراغ مہر تاباں بڑھ گیا
سامنے دونوں کے تھا میداں ہوائے وصل کا
رہ گئی پیچھے تمنا درد ہجراں بڑھ گیا
دیدۂ خورشید صبح و شام ہو جاتا ہے سرخ
کس قدر اس عہد میں آشوب دوراں بڑھ گیا
آرزو یہ تھی کہ آ جائے گلے میں تیرے ٹھیک
ایک ہی شب میں مہ نو کا گریباں بڑھ گیا
یہ تو چکی بار بار آنکھیں سے ڈھونڈا کریں
برق سے بھی غمزۂ عمر گریزاں بڑھ گیا

نعمتِ خلت کا جب سے ذوق میرے دل کو ہے
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیا

تیرا شیوہ دل فریبی کا بہت مشہور تھا
جاں ستانی کا بھی اب تو ساز و ساماں بڑھ گیا

اہلِ کشتی کو مسرت ہے چلی بادِ مراد
نامرادی کہہ رہی ہے اور طوفاں بڑھ گیا

ہو گا خود ساماں پیدا جب ہی کچھ دل میں جوش
شورشِ فریاد سے بر چھوں نیستاں بڑھ گیا

سچ یہ ہے جس روز نسیم اللہ مکتب میں گئی
دودھ تیرا اس دن اے طفلِ دبستاں بڑھ گیا

تھا یہ کس کی قبر کا سبزہ کہ جس کو دیکھ کر
پاؤں پھیلانے میں دامن سے گریباں بڑھ گیا

عہدِ پیری میں ہوا روشن بیانی کو فروغ
صبح ہوتے جلوۂ شمعِ فروزاں بڑھ گیا

ابنِ مریم ایک ہی ٹھوکر لگا کر رہ گئے
دو قدم ان سے مرا عیسیِٔ دوراں بڑھ گیا

یادگارِ نظم مصرع ناسخِ مغفور کا

(۱۵) سو چمن آگے مرا سرو خراماں بڑھ گیا (۱۱)

ساقیا خالی نہ جائے ابر یہ آیا ہوا
ہو رہے ہیں سرخ شیشے دل ہے للچایا ہوا
داغ دل چمکا جو اس کے طالب دیدار کا
جھلملاتا ہے چراغ طور شرمایا ہوا
عاشقوں کو ڈھونڈتے پھرتی ہو کیا محشر میں بھی
دھوپ میں پھرنے سے ہے کچھ رنگ سونلایا ہوا
دل بھی ٹوٹا بلبل ناشاد کا پھولوں کے ساتھ
دامن گلچیں میں اک غنچہ ہے کمھلایا ہوا
کشمکش میں آرزوئے قتل نکلے کس طرح
مضطرب میں بھی ہوں قاتل بھی ہے گھبرایا ہوا
آج پھر ناصح وہی چلتا ہوا فقرہ کہا
بارہا کا جو کہ ہے ارشاد فرمایا ہوا
دیکھئے تسکیں اس نے اعجاز مسیحائی کیا
رہ گیا تھا لب پہ بسمل دم ہونٹوں تلک آیا ہوا
بام پر وہ جلوہ فرما ہے مقابل کون ہو

چاند کچھ دب دب کے نکلا بھی تو شرمایا ہوا
سرو و سنبل دیکھتے ہی خاک میں مل جائیں گے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا ہوا
ابر تو آیا بھی ساقی اور برس کر کھل گیا
میری آنکھوں میں اندھیرا رہ گیا چھایا ہوا
کل تلک منہ ڈھانک کر سوئیں میں گھٹتا تھا نظم
آج داماں کفن منہ پر ہے دہرایا ہوا

(۲۱)　(۱۶)

بسکہ سیلاب بر فنا دار سخن ثابت ہوا
بلبلہ پانی کا بہ چرخ کہن ثابت ہوا
نقش باطل جب خیال ما و من ثابت ہوا
دھر میں انسان آدارد وطن ثابت ہوا
کہتی ہیں تیری نگاہیں تجھ پہ خون بے گناہ
او قدر انداز ناوک فگن ثابت ہوا
جب ہوا چلتی ہے نرگس کی جھپک جاتی ہے آنکھ
برق خاطف شعلہ رنگ چمن ثابت ہوا
منہ چھپا لینے کا ساماں ہو گیا محشر میں بھی

یوں اڑی رنگت کہ دامان کفن ثابت ہوا

رات کو یہ وہم تھا ہے عارض روشن پہ تل
صبح کو وہ نقش برگ یاسمن ثابت ہوا

سمجھے تھے دلدار و دلسوز و دلآرام اس کو حیف
دلفریب و دلربا و دل شکن ثابت ہوا

دل میں تیرے تو لگا کر تیغ ٹھنڈک پڑ گئی
کچھ گنہ میرا نہ اے شمشیر زن ثابت ہوا

اب کے ہے فصل جنوں میں ناتوانی اس قدر
پیرہن اپنا نہ اپنا پیرہن ثابت ہوا

ہم تو جینے ہی کو سمجھے تھے کہ مشکل ہے بہت
جان دینا بھی نہایت ہی کٹھن ثابت ہوا

دوش پر بکھرے جو گیسو یہ بھڑک کر رہ گیا
دل اسیر دام زلف پر شکن ثابت ہوا

سرخ اس کافر کی پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر
خون گردن پر تری اے برہمن ثابت ہوا

جی گیا آنے سے اس کے مر گیا جانے سے میں
مجھ میں اس میں ارتباط جان و تن ثابت ہوا

اس جہاں میں لوگ کہتے ہیں کہ تن ثابت نہیں
میں یہ کہتا ہوں کب اُس عالم میں تن ثابت ہوا

سختیاں جھیلے نہ کیوں انسان دنیا کے لیے
کوہکن پر کب فریب پیرزن ثابت ہوا

شوق میں اس جلوہ گہ کے مہرِ عالمتاب بھی
مثل اک ذرے کے آوارہ وطن ثابت ہوا

زلف و قد کا تھا جو سودا خون ہو ہو کر بہا
دل ہمارا کشتۂ دار و رسن ثابت ہوا

جھک پڑی چہرے پہ لہرا کے جو زلفِ پُرشکن
شاخِ سنبل کا ثمر سیبِ ذقن ثابت ہوا

قہر ڈھایا جب اٹھا مظلوم کے دل سے دھواں
ایک مورِ ناتواں بھی پیل تن ثابت ہوا

سر پہ تیشہ طرۂ خسرو کا دیتا ہے جواب
آج اے فرہاد تیرا بانکپن ثابت ہوا

وقتِ بد میں ہر طرف سے چشمکیں ہوتی ہیں نظم
آئینوں میں جا بجا سورج گہن ثابت ہوا

ہوا.

(۱۷)

آپ کی محفل میں آ کر دل مکدر لے چلا
آئینہ لایا تھا میں سد سکندر لے چلا

دیدہ تر لے چلا اشکوں کی چادر لے چلا
میں جدھر اٹھا بسان موج بستر لے چلا

دل صف مژگاں کی جانب سی مکدر لے چلا
میں بھی سرمہ کی طرح سے گرد لشکر لے چلا

سامری کے سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے
آ کے مٹی تیرے قدموں کی فسونگر لے چلا

روز محشر میری از خود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا

نیند میں تجھ کو بھی آخر کچھ خبر ہے یا نہیں
آہو آنکھوں سے تری کاجل چرا کر لے چلا

آ کے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف او ابر دریا بار لشکر لے چلا

دیکھنا صبح شب عشق اس کے گیسو کی شمیم
مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا

زلف برہم ہو کے الجھی چٹکیاں ہنگل تے لیں

بوسہ مجھ سے چھین کر بندے کا گوہر لے چلا
میں سرائے دہر میں ٹھہرا تھا مثل ابر و برق
کروٹیں دو چار ابھی لی تھیں کہ بستر لے چلا
میری پلکوں سے روانی اشک خون کی دیکھ کر
ابر تر آ کر رگ سودا پہ نشتر لے چلا
ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے
طوق قمری لے چلی طرہ صنوبر لے چلا
بھا گئی ہم کو یہ تیری سیر چشمی اے حباب
آن کر دریا میں بھی خالی ہی ساغر لے چلا
میں تو سمجھا تھا عدم سا بھی ہو نا حق جسے
ہائے پھر ہستی کی تہمت کیوں لگا کر لے چلا
میں ہمہ تن آہ و نالہ خواب مرقد سے اٹھا
استخواں ہر ایک اپنا صور محشر لے چلا
کاروان گل چلا آخر ہوئی فصل بہار
سبزہ خود رو چمن سے اپنا بستر لے چلا
وقت آخر آشنا سا ہو گئے سنبل کے داغ
خود میں اپنی قبر پہ پھولوں کی چادر لے چلا

بوِ شگوفوں سے نکل آئی گریباں پھاڑ کر
باغ کو جوشِ جنوں جامہ سے باہر لے چلا
عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

(۱۸) ولہ (۲۱)

آج محشر میں بھی ہوں تشنہ تری بیداد کا
میں گلا گھونٹوں خیال آئے اگر فریاد کا
دل کو ٹھکرے تو سہی ظالم ملا کر مجھ سے آنکھ
منہ ذرا دیکھوں تو میں ترکِ ستم ایجاد کا
لاش پر میری اگر آجائے وہ وعدہ خلاف
اتنا کہدینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد... کا
جانتے ہو پوچھنے سے حالِ دل ہوتا ہے رنج
نام کیوں لیتے ہو پھر اُس خانماں برباد کا
تھامنا مجھ کو یہی ہے کوئے قاتل کی زمین
ہر قدم پر سامنا ہونے لگا افتاد کا
ظلم سہہ کر بنا یا خود اسے سفاکِ خلق
داورِ محشر سے منہ پڑتا نہیں فریاد کا

نہر پر لہرا رہا ہوں میں بطا مے کے لئے
ڈھل گیا دن وہ وہ تک سایہ گیا شمشاد کا

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل و ہجر
شعبدہ یہ بھی تھا ایک اس چرخ بے بنیاد کا

عشق کا عالم نظر آتا ہے عالم ہی نیا
ہے زمیں افتاد کی اور آسماں بیداد کا

کون سنتا ہے میری فریاد اس کو دیکھ کر
پڑ گیا غل اہل محشر میں مبارک باد کا

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتہ
کچھ بگولے اٹھ گئے دیتا ہے نشاں صیاد کا

میں ابھی محو سراپا تھا کہ رات آخر ہوئی
وصل کی شب میں تھا عالم سایۂ شمشاد کا

چہرہ اترا ہی چلا جاتا ہے اس کا شرم سے
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کا

تیر خستہ ہوں میں غربت سے سدا اپنا وطن
جس جگہ جا مل گئی بستر ہوا آزاد کا

رہ گیا اپنا سا منہ لیکر میں شوق قتل میں

خنجر قاتل مجھے آئینہ تھا فولاد کا
ہائے کیا سہما ہوا تھا نالہ مرغ چمن
رہ گیا بن کر چراغ اک خانہ صیاد کا
لشکر باد بہاری اور رحیموں کی کشمکش
گل کا نکلا پیرہن شانہ چھلا شمشاد کا
شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکل عروس
ذہن میں لاؤں کہاں سے باقر داماد کا
دیدہ قتال نے مارا ہے کوئی پرساں نہیں
اس ستم اس قہر اس اندھیر اس بیداد کا
اے فلک اس گردش بیجا سے کیا حاصل ہوا
شاد کرنا بھی تجھے آیا کسی ناشاد کا
پاس میرے تم کو تو آتا نہیں یک دم قرار
ہے تعجب دل میں رہ جانا تمہاری یاد کا
ظلم نے آخر گورا کر لیا داغ فراق
دل پہ رکھا ہاتھ دامن چھوڑ کر جلاد کا

۱۵

ہرزہ گردی سے قدم سودی ہے سر پیدا ہوا

داغ سے دل درد سے اپنا جگر پیدا ہوا
وہ کھلیں کلیاں وہ مہکے پھول دے جلدی شراب
وہ ہوا آئی وہ ساقی ابر تر پیدا ہوا
عشق کا تیری اسی دن سے ہے سینے میں داغ
پرتو خورشید سے جس دن قمر پیدا ہوا
خون اسی دن سے جگر میرا ہے دل بیتاب ہے
جب حنا میں رنگ پتھر میں شرر پیدا ہوا
ہر گھڑی لپٹا رہتا ہوں کلیجے سے اسے
دوسرا معشوق یہ داغ جگر پیدا ہوا
دل کبھی آخر مرا دیتا ہو جھنجلا کے دعا
گیسوئے پیچاں کی صحبت کا اثر پیدا ہوا
میں نہ کہتا تھا کہ گلشن میں نہیں جاؤں حضور
نالۂ بلبل سے آخر درد سر پیدا ہوا
ہاتھ پھیلانے سے کچھ حاصل نہیں
دیکھ غنچہ کی طرف مٹھی میں زر پیدا ہوا
آتش افسردہ ہی کس نالۂ شب گیر سے
شور محشر کر گیا ایسا شرر پیدا ہوا

مرتبہ رکھتی ہے اے ناصح سیہ کاری مری
ابر رحمت سے مراد اہل تر پیدا ہوا

میری آنکھوں میں جہاں سارا تجلی زار تھا
نخل ایمن اس کو سمجھا جو شجر پیدا ہوا

آپ سے باہر ہوئے جس دم تو پایا [illegible] کو
اپنا گھر چھوڑا تو اس کے دل میں گھر پیدا ہوا

میری مٹی میں نہاں ہیں مثل اخگر سوزشیں
خاک جب سر کی ذرا داغ جگر پیدا ہوا

طور خاکستر ہوا ہے قوم موسیٰ کے لئے
تا حقیقت میں جو تھے کحل البصر پیدا ہوا

ہو چکی طے راہ ہستی جھک گیا اب قد راست
شکر ہے ملک عدم کا نظم در پیدا ہوا

۱۹ ولہ ۲۰

ہم فقیروں کا ٹھکانا بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہمنشیں ہو جائے گا

آکے میخانہ میں جو غفلت گزیں ہو جائے گا
دور گردوں اس کو دور ساتگیں ہو جائے گا

راستی گر چاہتا ہے کر تواضع اختیار
سیدھا اک سجدہ میں اسے نقش نگیں ہو جائے گا

دل کو روشن کر اگر ہے نیش زن زنبور غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا

بارِ عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا

لے چلی تختِ رواں سے خاکِ مدفن میں قضا
دیدۂ موراب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا

پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہہ دیگا یقیں ہو جائے گا

کچھ تو رہنے دے قیامت کے لئے بھی اے فلک
کیا عذابِ حشر سب مجھ پہ یہیں ہو جائے گا

خود نمائی اس قدر زیبا نہ واعظ خیر ہے
ناز یہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا

خامہ و ذہنِ رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا

تو ستارہ کو مرے اے پستی طالع نہ کھینچ

آسماں کا آسماں زیرِ زمیں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہے طرزِ نگاہ
زہر ہو جائے گا یا یہ انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقشِ دلِ میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں بے تیرے پہنچائیگا ساغر چشمِ زخم
خطِ پیمانہ نگاہِ نکتہ بیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا کے واعظ اسقدر
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

تجھ سے اٹھیگا بھلا پھولوں کے اس گہنے کا بوجھ
قدِ موزوں رشکِ شاخِ یاسمیں ہو جائے گا

پھر ذرا تم مڑ کے دیکھو تو سہی زندہ ابھی
کشتۂ تیرِ نگاہِ سحر مگیں ہو جائے گا

زلف گر ہو کر پریشاں کروٹوں میں آ گئی
کھا کے بل موئے کمر بھی عنبریں ہو جائے گا

درد دل کا نظم کو رہتا ہے روزا روز روز
جان سے بیزار اک دن ہمنشیں ہو جائے گا

۸ ۴۱

دل نے پھر وارفتہ حسن بت پہ فن کیا
اشک خون نے پھر چراغ آرزو روشن کیا
چھوٹ کر تیر اس کی چٹکی سے یہ دیتا ہے صدا
آفریں کیا کام تونے اے شکار افگن کیا
بوسہ لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے پھر منہ اس نے جانب گلشن کیا
گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
جم کے مسی نے لبوں کو غیرت سوسن کیا
شمع میں تو آج کی شب روشنی مطلق نہ تھی
تو نے آ کر خانہ تاریک کو روشن کیا
بعد مرنے کے بھی میں ایسا ہوں دشمن کام خلق
شمع نے گریہ نہ اک دن بھی سر مدفن کیا
ہے نگاہ یار شوق روزن دیوار یار
مثل دیوار اس نے دل میں بھی مرے روزن کیا
کون سنتا ہے فغان دہ فقیر کی ہم نے تو ظلم
آہ کی فریاد کی نالہ کیا شیون کیا

۲۲

اس نے دکھلا کے جھلک ہی جو دیوانہ کیا
تو نے حیرت زدہ حسن کو دیوانہ کیا
منزل دہر نہیں چھپاؤ نی چھپانے کا مقام
خاک میں مل کے یہاں نشو و نما ہوتی ہے
سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل
آج گردوں نے کیا شہرۂ آفاق جسے
کم نہیں دل سے ترے پردہ میں سویدا دل کا
پھر نہ آنکھ کا عشوہ نے سکھایا مجھ کو
اس کے تو سلسلۂ زلف میں آوارہ نہیں
سادگی آگئی حسن و ن سے گیا عہد شباب
الحذر ز ظلم بت جھک کے فلک ملتا ہے

۱۱

طور پر جا کے ادا سجدۂ شکرانہ کیا
آئینہ کو ترے جلوہ نے پریخانہ کیا
وہی عارف ہے گذر جس نے فقیرانہ کیا
سبز ہوتی کا نہ بارش نے کوئی دانہ کیا
قدر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
تنگ اوسے محفل احباب کا افسانہ کیا
اسی کا سینہ بنایا اسے پروانہ کیا
اس میں پیدا اثر گردش پیمانہ کیا
گوش زد یار کے کس نے میرا افسانہ کیا
پھر کبھی آئینہ دیکھا نہ کبھی شانہ کیا
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

۲۳

کھنچنے آئے گا سینہ سے جو پیکاں اپنا
اٹھ گئی کشتی مے بزم سے ہنگام سحر
اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
حشر کو دن بھی میں ہر ایک کا منہ تکتا ہوں

۱۶

پھر بیاباں تجھے مشکل ہے گریباں اپنا
دن جو پہ تخت اڑا لے گئیں پریاں اپنا
کچھ پتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا
کوئی اب بھی نظر آتا نہیں پرساں اپنا

ہوں وہ شوریدہ کہ موجوں کی طرح دریا بیچ
چاک ہوتا ہے گریباں پہ گریباں اپنا

کہیں ایسا تو نہو روز سیہ پیش آئے
نہ کہیں رنگ جمائے شب ہجراں اپنا

کی جو اخگر کی طرح گرد کدورت پیدا
دل گیا خاک میں آخر دل سوزاں اپنا

بس کہ تحصیل ادب ادیبوں سے ہے مجھ کو
ہے خرابات زمانہ میں دبستاں اپنا

دل یہ کہتا ہے کہ پھر فصل جنوں آئی ہے
خود بخود چاک ہوا ہے جو گریباں اپنا

اپنے ہی پاؤں میں چبھتے رہیں جو بوئے کانٹے
اپنے ہی سر پہ ہوا گر لئے احساں اپنا

جوش وحشت میں بھی پابند قناعت ہوں میں
اپنے دامن کو سمجھتا ہوں بیاباں اپنا

اس نے سو مرتبہ شب بھر میں سنوارے گیسو
آئینہ اس کا رہا دیدۂ حیراں اپنا

روز محشر کی بھی ایذا میں اٹھاؤں گا مگر
منہ دکھانا نہ مجھے اے شب ہجراں اپنا

سر بزانو ہوئے جب آپ میں رہتے نہیں ہم
جادۂ دشت ہے ہر بخیۂ داماں اپنا

لی خبر حضرت ناصح نے بڑی دیر کے بعد
چڑھ چکا تربت مجنوں پہ گریباں اپنا

وہ زمانہ بھی زمانہ تھا عجب اے حیدر
آشیاں اپنا تھا گل اپنے گلستاں اپنا

۲۶ ۱۴

ہر ستم مرغ چمن شور مچانا تیرا
زخم دل پر ہے نمک پر ترانہ تیرا

کبھی کہتا ہے جو بھولے سے کبھی آنا تیرا
یاد آتا ہے شب غم میں رلانا تیرا

کس کا شکوہ کروں کس کا نہ کروں شکوہ ہے
آسماں تیرا زمیں تیری زمانہ تیرا

اے فلک خوب ہوں آگاہ دو رنگی سے تیری
جانتا ہوں کہ رلائے گا ہنسانا تیرا

حوصلے رہ گئے اے فصل جوانی افسوس
ولولے دل کے سوا کم ہے زمانہ تیرا

غمزدہ درد رسیدہ ہوں میں اے شمع مزار
دل دکھاتا ہے مرا اشک بہانا تیرا

یوں نگہ پھیر لے وہ آنکھ ملا کر مجھ سے
اے اجل خوب سمجھتا ہوں بہانا تیرا

حال کھل جائیگا آنے دے بہار اے بلبل
پر اثر ہیں مرے نالے کہ ترانہ تیرا

بے مروت کوئی پھر تجھ سے ملے کس دل سے
آج تک یاد ہے وہ دل کا دکھانا تیرا

اے جنوں سچ ہے گلا کاٹ کے مرجانا تھا
خوب رسوا ہوئے کہنا جو نہ مانا تیرا

حسرت تیر نہیں بھی ہے جو ہیں یہ پامال
جب سے دیکھا ہے نشانہ کو اڑانا تیرا

تیر لگتا ہے کلیجہ پہ کبھی دل پہ کبھی
ٹھیک پڑتا نہیں نشانہ پہ نشانہ تیرا

مسکرائے جو شگوفے تو بہت رویا میں
ہونٹ تیرے مجھے یاد آئے دہانا تیرا

تا کجا شرح غم و درد خدارا حیدر
ہچکیاں لگ گئیں سن سن کے فسانہ تیرا

۲۵ ۱۳

مژدہ اے بادہ کشو ابر بہار آپہنچا
کوہ سے جھوم کے اٹھا لب دریا پہنچا

ہاتھ ملتے رہے سب اسکی دل آرائی پر
نہ گریبان تلک ہاتھ کسی کا پہنچا

چاند کو دیکھ کے طالع شب تنہائی ہیں
سیری آنکھوں میں امنڈتا ہوا دریا پہنچا

ایک خط اب نے لکھا بھی تو لکھا بہت جو
بعد مدت کے یہ تقدیر کا لکھا پہنچا

دوستو بہر خدا چھوڑ کے مرقد میں مجھے
اس طرف بھی کوئی بھولا کوئی بسرا پہنچا

خاک مرقد میں وہ ہے جذب کہ تم سن لینا
گرتا پڑتا اسی منزل پہ مسیحا پہنچا

گوشہ گیری کو وہ اللہ نے شہرت دی ہے
کہ نہ اس کے پر پروانہ کو عنقا پہنچا

چاہتا ہی نہ رہے خواب گران غفلت
دل پر اک زخم لگا زخم کو ایذا پہنچا

اس کے دربان نے کہا دیکھ کے زندانی مجھے
دیکھ لینا کہ چھٹا اور یہ سیدھا پہنچا

جلوہ شاہد معنی ہے حریم دل میں
آنکھ جب بند کی تا نہ نظر جا پہنچا

شانہ گیسو میں جو الجھا تو وہ مجھ سے الجھے
اڑ گئے زلف میں بل [illegible] جھٹکا پہنچا

شب غم میں ملک الموت کا آنا دیکھو
شکر ہے شکر اس آفت سے چھٹا پہنچا

مسند فقر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظم
نہ تو قیصر اسے پہنچا نہ تو کسریٰ پہنچا

۲۶ —— ۱۱

دل کا طالب وہ ہوا جان کا خواہاں ہوا
وہ ہوا درد کہ جس کا کوئی درماں نہ ہوا

قائل مہر و وفا دشمن ایماں نہ ہوا
[illegible] ہوا

کلب ہر زلف سیہ سلسلہ جنباں نہ ہوا
حیف صد دل کہ حریف غم [illegible] ہوا

ہم کو حاصل یہ ہوا پھونک کے خرمن اپنا
برق کہتی ہے کہ تنکے کا بھی احساں نہ ہوا

ہو گیا سانحہ اپنا بھی عجب عبرت خیز
مفت میں جان بھی دی یار پشیماں نہ ہوا

دل کا مطلب ازہی عنوان جبیں سے ظاہر
لاکھ لاکھ اس کو چھپایا کبھی پنہاں نہ ہوا

حلقہ دل زدگاں میں تھا گزرنا صبح کا
آج اس بزم میں وہ فتنہ دوراں آیا

ڈھا دیا دستِ اجل نے تو قضا نے لوٹا — کاغذ باد ہوا تخت سلیماں نہ ہوا

سارے عالم کا تو معشوق تھا اے حسنِ شباب — کس کا گیسو ترے ماتم میں پریشاں نہ ہوا

ہ مزاج آپ نے پوچھا تو گلہ کچھ بھی نہیں — شکر کرتا ہوں کہ شرمندۂ احساں نہ ہوا

فکر یا داشِ نہ کچھ شرمِ گنہ حیف کے ظلم
سر بہ زانو نہ ہوا سر بہ گریباں نہ ہوا

۲۷ — ۱۴

مختصر مرحلۂ طولِ امل کیا ہوگا — قطع یہ سلسلۂ بے تیغِ اجل کیا ہوگا

آج کچھ ہو نہیں سکتا ہے تو کل کیا ہوگا — سر پہ جب آن ہی پہنچے گی اجل کیا ہوگا

دور کر تیرگیٔ دل کہ ابھی تک ہے وقت — ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا

حسرتِ تیغ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے — ورنہ بے صوتِ حدی رقصِ جمل کیا ہوگا

چاہیے گوشۂ دل وادیٔ ایمن ہو نہ طور — جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا

ہاتھ میں چوم لوں زاہد ترے پہلے یہ بتا — میری بخشش کا سبب تیرا عمل کیا ہوگا

دیکھ کر زخمِ جگر کو مرے کہتا ہے رقیب — جس کا یہ پھول ہے اس تیغ کا پھل کیا ہوگا

قطعہ

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ — تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

جب میں کہتا ہوں چلو ترکِ محبت ہی سہی — اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا

حسنِ نیت تو ہے زاہد کا سبھوں کو معلوم — دیکھنا ہے کہ اثر حسنِ عمل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشہ عزلت میں ہم اب توڑ کے پاؤں
ہاتھ منت کش ارباب دول کیا ہوگا

تلخ کامی کی حلاوت کو نہ پوچھو ہم سے
اس سے بڑھ کر مزہ قند و عسل کیا ہوگا

بڑھتی جاتی ہے ہوس عمر ہے جوں جوں گھٹتی
اس کا انجام اب اے طول امل کیا ہوگا

نظم اک آنی و فانی ہے پھر اس سے ناقص
خالق لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

(۲۸) ——— (۱۵)

سرو کی طرح اگر برزدہ داماں ہوتا
مثل غنچہ کے نہ میں سر بگریباں ہوتا

رشک فغفور نہ ہم رتبہ خاقاں ہوتا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا مگر انساں ہوتا

کاش کے پیش نظر مجمع خوباں ہوتا
اور ان میں سے کوئی جان کا خواہاں ہوتا

مار ڈالا ہے زمانہ کی دورنگی نے مجھے
لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا

ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں ترے سر ٹیکیں
نقش پا کوئی تو اے عمر گریزاں ہوتا

چھپ گئے گرد میں سب قافلے والے افسوس
اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا

مرغ بسمل ہوں نہیں میرے تڑپنے کا علاج
چاہتا ہوں کہ وہی سرو ہی ساماں ہوتا

حلقے تدویر کو اک کے مسلسل رہتے
کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

تھاہ اس عالم اجسام کی لیتا کوئی
قطرہ میں بحر تو ذرہ میں بیاباں ہوتا

اعتبارات یہ ہستی کی بنا ہے عالم
ہم نہ ہوتے تو کہاں عالم امکاں ہوتا

نور تھا سوز غم ہجراں کا مجھے اے عطا
میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دیکھ لیتا جو کسی کے یہ ستارہ کا عروج
کہکشاں سے فلک انگشت بدنداں ہوتا

تجھکو ثابت قدم اے شمع سمجھتے جب ہم
سوزِ غم کی کوئی حد ہوتی نہ پایاں ہوتا

زاہدِ خشک تبا پھر تری کیا گت بنتی
کوئی سیخوار اگر دست و گریباں ہوتا

دل کا ارماں نکلنا تو ہے مشکل اے نظم
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

۲۹ ——— (۱۵)

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہوں سے زیادہ رم آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاشکے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

دم نکلتا بھی تو ہم ضبط ہی کرتے غم عشق
نیل ڈھلتا بھی تو آنکھوں میں نہ آنسو ہوتا

ہم سمجھتے کہ کیا سیماب کو کشتہ ہم نے
اگر اپنے دلِ بیتاب پہ قابو ہوتا

پیچ گھونگر نے جو ڈالے ہیں اگر کھل جاتے
کچھ کمر سے بھی نکلتا ہوا گیسو ہوتا

اثرِ آہِ رسا دل کو ہوا ہے حاصل
پھینک دیتے بھی وہ ناوک تو ترازو ہوتا

جیسا رسوائیوں کا میرے ہوا ہے یہ ہجوم
ایسا میلا بھی نہ آئی نہ لب جو ہوتا

دل کا بوجھ نکلتا جو کسی نالے میں
برجِ میزاں کے لئے سنگ ترازو ہوتا

میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

پرخطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
دن نکلتا بھی تو سہما ہوا جگنو ہوتا

آئے گلزار میں صیاد کو نیند آجاتی
شاخِ نرگس پہ جگایا ہوا جادو ہوتا

ضبط گریہ بہت آسان تھا مگر مشکل تھا
دل میں ناسور تو ناسور میں آنسو ہوتا

ہم دکھا دیتے کہ یوں دب کے نکلتا ہی چاند
بام پر سر کو جو نیو ہڑائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگانا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبار رم آہو ہوتا

۱۰

ہم سے بڑھ کر کوئی مجبور نہ ہوگا اے نظم
جان دینے پہ بھی اپنا نہیں قابو ہوتا

۳۰ ——— ۱۸

جلوہ گر آنکھ میں بھی دل میں بھی پنہاں دیکھا
دل کے آئینہ میں ہم نے رخ جاناں دیکھا
زیست میں چار طرف مرگ کا طوفاں دیکھا
تھم نہ پایا نہ قدم طول امل کے ہاتھوں
رشک ہے مجھ کو تری جامہ دری پر اے موج
پاؤں سے مور ملخ کے جو اٹھی گرد ذرا
دیکھا نشتر کوئی کاری تو زبان منت
عالم وجد میں کھینچا تھا ابھی دامن یار
لعل بھر آنے کو بہانہ ہے ذرا سا کافی
ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جلوہ گری خوب نہیں
جھوٹ ہے جھوٹ نہ جلسے تھے کبھی اور شباب

دیکھا دیکھا تجھے او فتنۂ دوراں دیکھا
طور پر آپ نے کیا موسیٰ عمراں دیکھا
تند آندھی میں چراغ تہ داماں دیکھا
کالے کوسوں پہ مسافر نے شبستاں دیکھا
جس طرف ہاتھ بڑھا اپنا گریباں دیکھا
میں نے اسمیں بجد التخت سلیماں دیکھا
دیکھا تجھ کو کوئی بچاری تو وہ احساں نہ دیکھا
آ گیا ہوش تو اپنا ہی گریباں دیکھا
رو دے بزم میں شیشہ کو جو گریاں دیکھا
سحر کہ رات کا ہے شمع فروزاں دیکھا
سچ تو یہ ہے کہ سب خواب پریشاں دیکھا

قسمت دہر میں لکھی ہوئی ہے ویرانی
میں نے ہر خاک کے ذرہ میں بیاباں دیکھا

جانے والوں میں اک دہر کو تو سبھی تھے لیکن
سب سے آگے تجھے اے عمر گریزاں دیکھا

تو کنارے پہ کھڑا ہو جو رہا چھوڑ کے راہ
تو نے اے سرو چمن کس کو خراماں دیکھا

عکسِ عارض سے کسی کے یہ ہوا جوشِ صفا
آب آئینہ سے اُٹھتے ہوئے طوفاں دیکھا

یہ نہیں جانتا کیا ہجر میں گذری مجھ پر
آنکھ کھولی تو طبیبوں کو ہراساں دیکھا

قہر تھا پائے نگاریں کا وہ ٹھوکر لینا
فتنۂ حشر کو بھی خون میں غلطاں دیکھا

کشتنی تھا کہ نہ تھا نظم نہ معلوم مگر
قتل کے بعد ستمگر کو پشیماں دیکھا

۳۱ ———— ۱۳

ر[illegible] الفت میں بس دم بھی یہ کب دل آیا
مثلِ آوازِ جرس کہیں وہ منزل آیا

قیس نے دیکھ لیا جب کہ لیلیٰ کا جمال
بید مجنوں جو نظر صورتِ محمل آیا

الفِ افسوس سے اپنے ہی زمانے کو سرو
اس غم آباد میں میں مثلِ جلاجل آیا

نگہ شوق نے یہ پردہ دری کیسی کی
آخر اس شوخ کو غصہ سرِ محفل آیا

برق [illegible] کہیں ہے روشِ عمر رواں
جس نے اک سانس لی وہ سینکڑوں منزل آیا

مثلِ سبزہ کے نہ سرسبز ہوا نام مرا
مثلِ دانہ کے نہ جیتے تک کے تہِ گل آیا

[illegible] ہوا کہ [illegible] دل میں
کب نظر موج ہوا کا کوئی ساحل آیا

اک گئی عمر زباں رک گئی چلتے چلتے
رشتۂ شمع نظر جادۂ منزل آیا

نیم جاں چھوڑ دیا مجھ کو تماشا دیکھو — رحم جلاد کو کیسا دم بسمل آیا

جان دے کر بھی نہ افسردہ ہوئی اہل کرم — ملک الموت کو سمجھے کوئی سائل آیا

نہ کسی جن کا گذر ہے نہ پری کا نشاں — تجھ پہ کوئی نہیں آیا ہی میرا دل آیا

خاکساری طلبوں کیلئے رفعت ہے عجب — دوش احباب پہ میں ہو کے سبک منزل آیا

سات پردوں کو جو آنکھوں کے اٹھایا نظم

مجھ میں اور اس میں نہ پردہ کوئی حائل آیا

۳۴ — (۱۱)

زندگی کیا ہے اک افسانہ کا دہرا جانا — موت کہتے ہیں کسے زیست سے اکتا جانا

یاد ہے بزم مسرت میں ترا آجانا — جلوۂ حسن سے وہ شمع کا شرما جانا

مغتنم قلزم ہستی میں ہے تارِ نفس — ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا جانا

کبھی آنے نہ دیا خاطرِ نازک پہ ملال — مجھ سے دیکھا نہ گیا پھول کا کمہلا جانا

دل ہے دل اس کا تحمل ہی تحمل اس کا — کوہ کو جس نے پر کاہ سے ہلکا جانا

ہم کو عبرت نہیں اس بے خبری پر اپنی — کہ طلسمات دو عالم کو تماشا جانا

نہیں معلوم کہاں آئے کہاں جانا ہے — ایسا آنا ہی نہ اچھا تھا نہ ایسا جانا

آشیانہ کے سزاوار نہ تھا پیکر خاک — طائر روح نے اک شب کا بسیرا جانا

میں نے ہر ذرہ کی آغوش میں صحرا دیکھا — میں نے ہر قطرہ کو جولانگہ دریا جانا

جنبشِ بادِ بہاری نے نکالی ہے یہ چھیڑ — برق کو ابر کے آغوش میں تڑپا جانا

کس سے پوچھا تھا پتہ کس نے بتایا اے نظمؔ
کس طرح آپ نے میخانہ کا رستہ جانا

۳۴ —————— دل —————— ۱۱

تنِ خاکی میں ہے افسردہ مرا دل ایسا
کوئی دانہ ہو الٰہی نہ تہِ گِل ایسا

کون ہے اپنے ہوا خواہوں کا قاتل ایسا
شکل تو چاند سی ہے آپ کی اور دل ایسا

بھر گیا پھولوں سے دامانِ نظر حسبِ سماع
اس قدر کثرتِ گل شورِ عنادل ایسا

گور میں بھی نہیں طوفانِ حوادث سے مفر
موج تو ایسی بلا خیز ہے ساحل ایسا

میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا سرانجام ہے کیا
ل رہے ہیں کفِ افسوس جلاجل ایسا

عفو فرمائے خدا صبح تو میں اتنا ہوں جہول
اس نے دیکھا ہے کوئی حور شمائل ایسا

بخش دے خلد کا گلزار وہ ایسا ہے کریم
ایک کاہ کی پرسش کرے عادل ایسا

تیز رو جب تجھے اے ناقۂ لیلیٰ سمجھیں
دیکھ لے قیس اڑے پردۂ محمل ایسا

تخم باقی نہ رہا کشت جو سرسبز ہوئی
سبزہ آتے ہی گیا رخ سے ترے تل ایسا

ہاتھ انگڑائیاں لے کے بڑھاتے ہیں جو رند
کشتیِ مے کے لئے چاہیے ساحل ایسا

نظمؔ نے ظلم سہے اور کبھی اُف منہ سے نہ کی
ہم نے دیکھا جگر ایسا نہ کہیں دل ایسا

۳۴ —————— فعلاتن فعلاتن فعلن —————— ۱۱

آ گیا پھر رمضاں کیا ہو گا
ہائے اے پیرِ مغاں کیا ہو گا

باغ جنت میں سماں کیا ہوگا
تو نہیں جب تو وہاں کیا ہوگا

خوش وہ ہوتا ہے مری نالوں سے
اور انداز فغاں کیا ہوگا

دور کی راہ ہے سالک ہیں تھکے
اتنی مہلت ہی کہاں کیا ہوگا

دیکھ او رنگ پریدہ کو مری
دل جلے گا تو دھواں کیا ہوگا

ہوگا اک نگہ میں جو تمام
وہ بہ حسرت نگراں کیا ہوگا

ہم نے مانا کہ ملا ملک جہاں
نہ رہے ہم تو جہاں کیا ہوگا

مر گئے جب خاک میں ملنا ٹھہرا
پھر یہ تربت کا نشاں کیا ہوگا

جس طرح دل ہوا ٹکڑے از خود
چاک اس طرح کتاں کیا ہوگا

یا ترا ذکر ہے یا نام ترا
اور پھر ورد زباں کیا ہوگا

عشق سے باز نہ آنا حیدر
راز ہونے دے عیاں کیا ہوگا

۱۴ متفاعلن چار بار ۳۵

یہ ہوا مآل حباب کا جو ہوا میں بھر کے ابھر گیا
کہ صدائے لطمۂ موج کی یہ غرور کدھر گیا
مجھے جذب دل نے بٹھا دیا جو بہک کے رکھا قدم کوئی
تجھے پر لگا دیے شوق نے کہیں تھک کے میں جو ٹھہر گیا
مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر

کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا
اثر اس کے عشوۂ ناز کا جو ہوا وہ کس سے بیاں کروں
مجھے تو اجل کی ہے آرزو اسے وہم ہے کہ یہ مر گیا
تجھے اے خطیبِ چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں
کہ کتابِ گل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا
اسے تو سنا تا ہے ہمنشیں کہ ہے عشق دشمنِ عقل و دیں
تری کہنے کا ہے مجھے یقیں میں ترے ڈرانے سے ڈر گیا
کروں ذکر کیا میں شباب کا سنے کون قصہ یہ خواب کا
یہ وہ رات تھی کہ گذر گئی یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا
دلِ ناتواں کو تکان ہو مجھے اس کی تاب نہ تھی ذرا
غمِ انتظار سے بچ گیا تھا نویدِ وصل سے مر گیا
مرے صبر و تاب کے سامنے نہ ہجومِ خوف و رجا رہا
وہ چمک کے برق رہ گئی وہ گرج کے ابر گذر گیا
مجھے بحرِ غم سے عبور کی نہیں فکر اے مرے چارہ گر
نہیں کوئی چارہ کار اب کہ سر سے آب گذر گیا
مجھے رازِ عشق کے ضبط میں جو مزہ ملا ہے نہ پوچھئے
مے و انگبیں کا یہ گھونٹ تھا کہ گلے سے میرے اتر گیا

نہیں اب جہاں میں دوستی کبھی راستی میں جو مل گئے
نہیں مطلب ایک کو ایک سے یہ ادھر چلا وہ ادھر گیا
اگر آگے غصہ نہیں رہا تو لگی تھی آگ کہ بجھ گئی
جو حسد کا جوش فرو ہوا تو یہ زہر چڑھ کے اتر گیا
تجھے نظم وادیٔ شوق میں عبث احتیاط ہی اس قدر
کہیں گرتے گرتے سنبھل گیا کہیں چلتے چلتے ٹھہر گیا

۳۶ مفعلات فاعلاتن دوبار 11

کہیں تاب ہی سماعت مرا حال زار ہوتا
کہ فسانہ خوب تھا یہ اگر اختصار ہوتا
غم عشق تھا تو پھر کیوں غم روزگار ہوتا
نہ یہ جن کبھی اترتا نہ جنوں سوار ہوتا
نہیں خود کو دیکھ سکتا کہ جہاں میں خود ہی یکتا
کبھی اپنے عکس سے بھی وہ نہیں دوچار ہوتا
نہیں تاب ضبط غم کی مرے مشت استخواں میں
بھڑک اٹھتا خس میں پنہاں جو ذرا شرار ہوتا
در دوست کی طلب میں مجھے کیا برا تھا مرنا
جو قدم قدم پہ ہوتا جو ہزار بار ہوتا

مجھے اس خیال پریس ہے امید عفو اس سے
کہ وہ چاہتا تو ہرگز نہ میں بادہ خوار ہوتا

نہیں اعتنا کے لائق یہ وجود بے حقیقت
کہ اگر لباس ہوتا تو یہ مستعار ہوتا

میں سمجھتا مستحق ہوں نہیں سزا کا یا جزا کا
مری ہست و بود کا بھی تو کچھ اعتبار ہوتا

اگر اپنے سوز غم کو نہ دبا دبا کے رکھتا
تو حیات کے اخگر اخگر ابھی اک شرار ہوتا

وہ مآل زندگانی جسے کہتے ہیں غم عشق
یہ اگر پہاڑ ہوتا تو نہ دل پہ بار ہوتا

دل ناکش میں قائل قدر افگنی کا تیری
کوئی تیر ایسا ہوتا کہ فلک کے پار ہوتا

۳۷ — مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات — ۹

جہاں میں کوئی نہ کوئی عدوئے جاں ہوگا
جدھر سے قافلہ گزرے گا خاکسار ہوگا
لگا کے تیر مجھے روئے گا لہو ظالم
یہ آکے دیکھ کرامات میکدہ اے شیخ

ہوا چمن میں نہ گل چین نہ باغباں ہوگا
سپہر ناز کش گرد کارواں ہوگا
کہ موج خوں اسے خمیازہ کماں ہوگا
کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

گلا جو کاٹ کے مر جائے تو یہ ڈر ہے
کہ سب کا اس ستم ایجاد پر گماں ہوگا

نگاہ اس نے جو پھیری تو مر مٹا دل زار
خبر نہ تھی کہ یہ ایسا مزاج داں ہوگا

لگا کے تیغ بگڑیے نہ کیجیے انصاف
تڑپ سکے گا وہ کیونکر جو ناتواں ہوگا

غضب کیا جو کسی کے خرام کو دیکھا
نہ جانتا تھا کہ دل یوں رواں دواں ہوگا

خدا کو ڈھونڈنے جاتا ہے کیا کہیں اے نظم
ہر ایک جا وہ ملیگا جو بے نشاں ہوگا

۳۸ —————— ۱۶

کہا جو تو نے دل ناصبور میں نے کیا
بتا کہ تو نے کیا یا قصور میں نے کیا

بغل سے دل کو نکالا کے پھینک دیا
یہ ایک مفت کا جھگڑا تھا دور میں نے کیا

یہ تم کہو کہ نہ آنا یہاں نہ آؤں میں
ضرور تم نے کہا اور ضرور میں نے کیا

تمہارا ذکر ہی کیا تم کو کون کہتا ہے
فساد میں نے اٹھائے فتور میں نے کیا

کہا تھا کس نے کہ موسیٰ سی تو لڑا آنکھیں
اشارہ تجھ سے تھا اے برق طور میں نے کیا

جہاں کہیں ہوئی کثرت رہا میں آپ سے دور
جہاں ملی مجھے خلوت ظہور میں نے کیا

رہوں میں بستہ گریباں یہ امر تھا دشوار
یہ سہل تھا کہ گریباں کو دور میں نے کیا

پھرا نہ موج حوادث سے لاکھ منہ پھیرا
چڑھاؤ کاٹ کے آخر عبور میں نے کیا

لگا نہ خاک سے دامن نہ خاک دامن سے
صبا کی طرح جہاں سے مرور میں نے کیا

اب آ بنی ہے پاؤں سے پیری میں سر نہیں اٹھتا
سزا اسی کی ہے جیسا غرور میں نے کیا

وہ حشر میں بھی ملیں مجھ سے یہ نہیں امید
خفا ہیں اس لیے کیوں صف [illegible] کیا

یہ اڑ کے تخت سلیماں کی خاک کہتی ہے
بسیرا اب سر بال طیور نے کیا

وہ میری نالہ سوزاں کو کیا سمجھتے ہیں
قیامت آئی اگر نفخ صور میں نے کیا

حد لے نے منہ میں بان دی زبان میں لکنت
اس ادا سے بات پہ کتنا غرور میں نے کیا

نگاہ شوق سے میری سکھا دی آرائش
طرہ کو شانہ کش زلف حور میں نے کیا

جو مجھ سے کہتے ہیں اے نظم حسن ظن لعاب
تو میں سمجھتا ہوں کچھ کرو زور میں نے کیا

۱۶ —————— ۳۹

ہزار آنکھ پڑی جب غبار بام آیا
ہمارے حسن پہ [illegible] آیا

یہ کیوں کہا تھا کہ میرا نہ کام آیا
کہا سحر ہے وہ ظالم تو وقت شام آیا

ہماری حصہ میں جھوٹا جو اس کا جام آیا
لب نگار رہی [illegible] پیام آیا

ہر سب کو خانہ خرابی پہ شستہ تعمیر
ہوا غبار ہوا اونچا تو [illegible] بام آیا

جو بھول کر بھی خوشی کا گذر ہوا لیکن
خیال موت کا لینے کو انتقام آیا

دیار عشق میں وہ صاحب نگیں ہوئیں
کہ یار کے لب لعلیں پہ میرا نام آیا

ترانہ سنج ہوائے عندلیب تیرے لئے
ہر ایک گل کے گلگونہ کا [illegible] جام آیا

کلیجہ پک گیا ناصح کو منہ لگانے سے
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کیا خیال خام آیا

عذاب جاں مجھے ہو جاتی شام تنہائی
بھلے کو ساتھ بلاؤں کا ازدحام آیا

بڑا یہ حق محبت ادا کیا اس نے — کوئی جو ساتھ جنازے کے چند گام آیا
زباں کہ دانتوں نے پیری میں ساتھ چھوڑ دیا — کوئی رفیق برے وقت میں نہ کام آیا
گیا ہے لینے کو اسکے مگر یقیں ہے مجھے — پیام بر کے لئے موت کا پیام آیا
گماں رقیب کا ناصح یہ ہے بجا مجھ کو — کلیجہ تھام لیا جب کسی کا نام آیا
کھلے جو بند قبا شب کو اس کے میں سمجھا — کہ صبح حشر ہوئی وقت انتقام آیا
نگاہ ہو کے پریشاں پھری ہے کاکل سے — عجب ہے یہ کہ یہ رشتہ تھا ان کے دام آیا

خدا کا خوف کرو نظم ہوش میں آؤ
کرو شراب سے توبہ مہ صیام آیا

۴۰ — ۱۶

بہ شہوت و غضب آلودہ دل ما را — بکعبہ طرح بنا ریختی کلیسا را
ز خویش رفتہ گرفتیم راہ صحرا را — سلام ما کہ رساند دیار سلمی را
بہ بزم جلوہ برفتیم و ہمچو آئینہ — فروختیم بیک عشوہ دین و دنیا را
اگر چہ رخصت دیدار دادہ ما را — نگاہ قہر تو خوں می کند تماشا را
ہوائے ابر بفزود جوش صہبا را — شکست توبہ صدا کرد جام و مینا را
گذشت عمر و ندیدم کہ آسمان بکشود — بناخن مہ نو عقدہ ثریا را
قلیل فرصت عمر و کثیر حاصل عمر — حباب چشم گشود و بدید دریا را
غبار بام ربود ست و گرد باد ستوں — عجب کہ خانہ بر انداختند صحرا را

عبور بحر معانی و دستیاری کلک / شگافتم به عصا چون کلیم دریا را

حذر ز آه فلک تاز تو دل بیمار / که شکل دار بپا ده آورد مسیحا را

هزار معنی ثبت زنفی می خیزد / که نیستی پر پروانه داد عنقا را

به جستجوی تو ام مثل دانه تسبیح / سپرده ام به سر این راه گام فرسا را

دلم گداخت چو مینا زهول گرمی شعر / به بین حرارت اندیشهای فردا را

نشاده ام به ره شوق همچو نرگس زار / که آوریم بکف دامن مسیحا را

سراغ میکده دل گرفته ام از شاد / خبر کنید حریفان باده پیما را

مخور فریب بظن تشنه لب بمیر ای نظم
سراب آئینه دار است حال دنیا را

۱۱ ——— ۱۰

من و نگاه تو با کیف می چه کار مرا / من و بهار تو با فصل دی چه کار مرا

بغیر صور سرافیل محشر است اینجا / فغان چو خیزدم از دل به نی چه کار مرا

من و شناگری لذت جفای حبیب / به شکوه ستم پی به پی چه کار مرا

فریب عشوه دنیا نخورده ام مخمورم / بناز و غمزه بیجاش هی چه کار مرا

ز بیخودی به گذشتم ز لامکان و مکان / به فکر هستی لاشی و شی چه کار مرا

بلند شد علم مهر و شبنم از جا شد / که با مسابقت ظل و فی چه کار مرا

بمن چو دوست شدی بس ضمان من تست / چنین مگو که بکردار وی چه کار مرا

جز اے ترک وفا ابن سعدی و انت | ولے نہ گفت کہ با ملک ز چہ کار مرا

ق

بہ ظل معدلت خسرو دکن اے نظمؔ | بہ عدل و سطوت کسری و کے چہ کار مرا

وظیفہ ام رسد از خوان نعمت عثمان خلد اللہ

بوصف حاتم طائی و طے چہ کار مرا

۴۲ ——— مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات ——— ۱۲

دل بار عشق کا متحمل نہیں ملا | سر سجدۂ نیاز کے قابل نہیں ملا

دریائے عشق میں سے کے دو ہاتھ رہ گیا | موج ضعیف تھی مجھے ساحل نہیں ملا

کیا جانے لطف عشق بحث بے مزہ | ناصح تجھے دماغ ملا دل نہیں ملا

محروم ہم ہیں عید میں بھی او جفا شعار | اب بھی گلے سے خنجر قاتل نہیں ملا

جادہ ملا تھا رشتۂ تسبیح کی طرح | آرام مجھ کو سیکڑوں منزل نہیں ملا

گردش سے ہم بھنور میں ہیں جس طرح ملال | کشتی اگر ملی بھی تو ساحل نہیں ملا

کہنے بہ پست جبر گوارا کیا تو کیا | کس کام کا ملاپ اگر دل نہیں ملا

ابرو کا اس کے ہمسر ابرو جو بن گیا | ایسا کسی کو مد مقابل نہیں ملا

انساں کا دل تھا بار امانت کے واسطے | اس درد کا کوئی متحمل نہیں ملا

ہو کر نفس گستہ بعرض شوق کیا | اچھا ہوا کہ قیس کو محمل نہیں ملا

اک برق تھی کہ آگ لگائی نکل گئی | بسمل پھڑک کے رہ گئے قاتل نہیں ملا

ہے نظم نیم جاں پہ چھری تیز رات دن
قاتل کو دوسرا کوئی بسمل نہیں ملا

یاد میں بخیر جلوۂ دلکش بہار کا — تھا یہ بھی شعبدہ کوئی لیل و نہار کا
پشتارہ لے چلا ہوں غم روزگار کا — گنبد ذرا بلند ہو میرے مزار کا
اونچا ہوا غبار جو اس خاکسار کا — پہنچا فلک کو گور میں صدمہ فشار کا
ہو بوالہوس اور اہل جنوں کا مقابلہ — کیا توڑنا ہے سہل گریباں کے تار کا
ٹپکیگا خون برق کی لہروں سے باغ میں — ہے جوش میں لہو رگ ابر بہار کا
ہم تو پچھڑ اسطرح سے گرے پھر نہ اٹھ سکے — کیا پوچھنا غبار رہ سبزہ گزار کا
حاصل نہیں ہے زیست کا جز رقص بیخودی — لو میں سمجھ گیا یہ اشارہ شرار کا
ہے لوٹنا پسند مجھے شاخ بید کا — ہے جھومنا پسند مجھے لالہ زار کا
دیوار ڈھانے کو ہی نشونما ہے تاک — دامن پکڑ لیا ہے نسیم بہار کا
ہستی کا قافلہ ہی عدم کی طرف رواں — دور سپہر ایک تتق ہے غبار کا
مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں — بازار دہر میں ہے چلن اعتبار کا
ہر دم ہی وہم شماری پیہم سے دل کو کام — کھٹکا لگا ہوا ہے یہ روز شمار کا
ناداں اپنے نفس پہ کرتا ہے آپ ظلم — شکوہ زباں پہ ہے ستم روزگار کا
اس زلف مشکبو کی سیاہی کہیں سے لے — کالا کروں گا سینہ میں شب انتظار کا

سجدہ کیا ہے جب سے ترے آستان کو — ہے عرش پر دماغ ترے خاکسار کا
شاہوں کو ناز تخت مرصّع پہ ہے تو ہو — مالک ہوں میں بھی کلبۂ جواہر نگار کا

٤٤ — ٢٣

سینہ میں اُس کے دل میں کچھ ارمان ہو تو کیا — آنکھوں میں اشک اشک میں طوفان ہو تو کیا
سر پر یہاں نہیں ہے جو سامان ہو تو کیا — دامن ہو تو کیا جو گریبان نہ ہو تو کیا
دو دن کے واسطے سر و سامان ہو تو کیا — سب کچھ سہی جو دل ہی میں ارمان نہ ہو تو کیا
ہیکل پہ ہاتھ رکھ کے قسم کھا گئے ہیں وہ — بد عہد کے گلے میں جو قرآن نہ ہو تو کیا
کیا اے فلک ملا ہمیں بازار دہر سے — ظالم متاع درد بھی ارزاں نہ ہو تو کیا
لایا ہے کوئی ساتھ نہ لیجائے گا کوئی — دولت ہو اور عادت احسان نہ ہو تو کیا
ہے قد سے قد ملا کے بہت سرو کو غرور — اس طرح ناز سے جو خراماں نہ ہو تو کیا
نالوں سے جب زباں نہیں لگتی جناب کی — تا صبح بھلا دماغ پریشاں نہ ہو تو کیا
راضی ہوں قصد خون سے نہ بچ کیجئے — تسکین دل جو عیسیٰ دوران نہ ہو تو کیا
سالک کو حق کے ڈھونڈی میں ہے کچھ مزا — اس راستہ میں بھول بھلیاں[1] نہ ہو تو کیا
دن میری زندگی کے گذر جائیں صبح تک — ایسا بھی طول شب ہجران نہ ہو تو کیا
رکھا نہ سعی نے کہیں کا ہزار حیف — بندہ ہوا اور تابع فرمان نہ ہو تو کیا
مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال — معلوم اس کو حال پریشاں نہ ہو تو کیا

[1] بھول بھلیاں محاورہ میں مفرد مؤنث ہے ۱۲

مانا کہ تو نے جوگ لیا دردِ عشق میں
یہ تو بتا کہ چاکِ گریباں سے فائدہ
مانا کہ تیرے اشک میں گوہر کی ہے چمک
اچھا یہی سہی کہ وہ محشر خرام ہے
یوں خاک خونوں میں لوٹے گئے ستم تو کیا اٹھو ل
جھک جھک کے ڈھونڈنا ہی عبث اس گلی میں تو
جاتا ہے اس کے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے
گر اذنِ عام غیر کو ہے تو ہوا کرے
کہتے ہو جو پڑے گی مصیبت اٹھائیں گے
سوچے ہو جان دینگے جو دشوار ہو گا وصل

اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہ ہو تو کیا
جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہ ہو تو کیا
عارض پہ اس کے وصل میں غلطاں نہ ہو تو کیا
تیوروں کے نیچے دیدہ حیراں نہ ہو تو کیا
قاتل کا اپنے ہاتھ میں داماں نہ ہو تو کیا
اس خاک میں تر اداغ ہی لالہ نہ ہو تو کیا
گر تیرے روشناسوں میں درباں ہو تو کیا
تیر الذ رہاں کسی عنواں نہ ہو تو کیا
لیکن وہ ظلم کر کے پشیماں نہ ہو تو کیا
مرنا بھی مرحلہ جو آساں نہ ہو تو کیا

۵۴

بندہ کسی طرح نہ سزائے جحیم تھا
کوٹھے پہ آ کے نعش کا جانا تو دیکھ لے
واعظ خدا کے واسطے اس کو تو دیکھ
کیا کرتے ہم کہ ضبط سے گھبرا گیا تھا جی
نازک ہی انتہا کا دماغ فرشتی
دنیا کی نعمتوں میں برابر کا نہ سہی

۱۱

یارب میں روسیاہ سہی تو کریم تھا
لے اٹھ گیا جو تیری گلی میں مقیم تھا
پیتے اگر نہ مے تو گناہِ عظیم تھا
کھینچی اک ایسی آہ کہ بس دل دو نیم تھا
ہم کو تو سر اٹھانا ہی بارِ عظیم تھا
اصلاح تو یہ دیکھئے آخر حکیم تھا

اب ہم تھے اور حسرتِ اعمال قبر میں
آخر کوئی رفیق نہ کوئی ندیم تھا

دنیا سے دل اٹھا کے محبت بھی دیکھ لی
اک دوش پر جنازۂ امید و بیم تھا

ساتوں فلک نہ بارِ امانت اٹھا سکے
ہم نے اٹھا لیا وہ جو بارِ عظیم تھا

اے آسمان میری تباہی روا نہ تھی
تھا خاک بھی تو خاکِ رہِ مستقیم تھا

اے نظمؔ خوب راہ نمائی جنوں نے کی
گلشن سے لے کے دشت تک اک خطِ مستقیم تھا

۱۶ — ۱۵

میں پا کے اس سے عفو کا پروانہ جھپٹ گیا
اہلِ خرد دھرے گئے دیوانہ جھپٹ گیا

کیا حالِ پر ملال شبِ غم بیاں کروں
ظلمت وہ تھی کہ شمع سے پروانہ جھپٹ گیا

آتی تھی اب مزہ پہ کہانی شباب کی
کس لطف کے مقام سے افسانہ جھپٹ گیا

کس راستہ میں ناقۂ لیلیٰ کو لے چلا
اے ساربان قیس کا ویرانہ جھپٹ گیا

مستی میں ایک کی نہ رہی ایک کو خبر
شیشہ سے بزمِ عیش میں پیمانہ جھپٹ گیا

کاجل لگا کے لاش پہ رونے کو آئی تھے
اشکوں سے رنگِ نرگسِ مستانہ جھپٹ گیا

تو اضطرابِ شوق بھی نکلا حریفِ غم
چٹکی میں آ کے شمع کی پروانہ جھپٹ گیا

قابو سے نفسِ بد کو نکلنے نہ دے کبھی
پھر شیر ہی جو یہ سگِ دیوانہ جھپٹ گیا

دیکھا فریبِ حیرتِ بزمِ وصال کا
دستِ مژہ سے سبحۂ صد دانہ جھپٹ گیا

دی آکے کیا نسیم نے حیرت فزا خبر
ہر شاخِ گل کے ہاتھ سے پیمانہ جھپٹ گیا

تھا وصل روح و تن نفس واپسیں تلک
دم بھر میں ایک عمر کا یارانہ چھٹ گیا

احساں یہ کیا عرق انفعال نے
دامن سے داغ گریۂ مستانہ چھٹ گیا

واعظ بتا مجھے کہ یہ کس کی نظر لگی
ہونٹوں تک آکے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

زاہد جو شہر چھوڑ کے صحرا نشیں ہوا
اس کو یہی قلق ہے کہ میخانہ چھٹ گیا

دکھلائے کیا وطن میں اب اے نظم منہ بھلا
ہو اس لیے اداس کہ ویرانہ چھٹ گیا

۴۷ —— مفعول فاعلاتن دوبار —— ۱۴

پرسش جو ہوگی تجھ سے جلاد کیا کرے گا
لے خوں میں نے بخشا تو یاد کیا کرے گا

ہوں دام میں پرافشاں اور سادگی سے حیراں
کیوں تیز کی ہیں چھریاں صیاد کیا کرے گا

ظالم یہ سوچ کر اب دیتا ہے بوسۂ لب
جب ہونٹ سی دیئے پھر فریاد کیا کرے گا

زنجیر تار داماں ہے طوق اک گریباں
زور جنوں نہ کم ہو حداد کیا کرے گا

ہم ڈوب کر مریں گے حسرت رہے گی تجھ کو
جب خاک ہی نہ ہوگی برباد کیا کرے گا

یعقوب قطع کردیں امید وصل دل سے
یوسف سا بندہ کوئی آزاد کیا کرے گا

دل لے کے پوچھتا ہے تو کس کا شیفتہ ہے
بھولا ابھی سے ظالم پھر یاد کیا کرے گا

اے خط بیاض عارض درکار ہے جو تجھ کو
تحریر حسن کی کچھ روداد کیا کرے گا

کنج قفس سے اک دن ہوگی رہائی اپنی
مر جائیں گے تو آخر صیاد کیا کرے گا

مثل سپند دل ہے بیتاب سوز غم میں
رہ جائے گا تڑپ کر فریاد کیا کرے گا

اے شیخ بھر گیا ہے کیوں وعظ کی ہوا میں
ریش سفید اپنی برباد کیا کرے گا

ظلم و ستم سبھی اب ظالم نے ہاتھ کھینچا
اس سے ستم وہ بڑھ کر ایجاد کیا کرے گا

از بسکہ بے ہنر ہوں میں ننگ معترض ہوں
مضموں پہ میرے کوئی ایراد کیا کرے گا

اے نظم جس کو چاہے وہ دے بہشت دوزخ

نمرود کیا کرے گا شداد کیا کرے گا

۴۴ —— مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن —— ۲۰

واعظ نے در کعبۂ عرفاں نہیں دیکھا
عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

جی بھر کے ابھی جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
تم نے اسے اے موسیٔ عمراں نہیں دیکھا

گلشن نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
جمعیت دل کا کہیں ساماں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسمات خودی کا
ویراں اُسے دیکھا بھی تو ویراں نہیں دیکھا

دل تا لب خاموش ہے نالہ کی گذرگاہ
گردوں کو حریفِ خم چوگاں نہیں دیکھا

پھر رک نہ سکینگی یہ جوانی کی امنگیں
روکو ابھی توسن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمیں گاہ سے واقف ہے بھلا کون
کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

کیا جانے پریشانی خاطر وہ کسی کی
اس نے تو کبھی خواب پریشاں نہیں دیکھا

پہنچا وہی منزل پہ ملی جس کو رہ راست
اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں جسے سمجھے اُسے آسان ہی پایا
مشکل جسے سمجھے اُسے آساں نہیں دیکھا

دم لے کے ذرا راہ میں جب تک کہ میں اٹھوں
کوسوں تجھے اے عمر گریزاں نہیں دیکھا

رہ رہ کے اڑی خاک سلاطین سلف کی
گردوں سے کبھی دست و گریباں نہیں دیکھا

جس تیر نے پلہ نہ کیا ہے وہ پرکاہ
بیکار ہے جس تیغ نے میداں نہیں دیکھا

وادی حقیقت میں پھرا ہو وہی جانے
ایسا ابھی جنوں خیز بیاباں نہیں دیکھا

ہے گلکدۂ دہر میں حیرت کی تجلی
نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

مستوں کیلئے رشک کی جا ہے سفر برق
جز ابر سیہ و ز شبستاں نہیں دیکھا

کیا حال گلستاں کا ہے جھکو نسے خزا نکے
طاؤس کو اس طرح پر افشاں نہیں دیکھا

ہے سایہ فگن فرق پہ گرد قدم اپنی
پھرتے ہوئے یوں چتر سلیماں نہیں دیکھا

وحشت میں بھی پابند رہا وضع کا اپنی
توجیہ کوئی جز چاک گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظم اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی برزدہ داماں نہیں دیکھا

۴۹ ۲۰

سب دل کا بخار آنسوؤں کے تار نے کھینچا
آندھی کو رگ ابر گہربار نے کھینچا

سر اشک کے سیلاب میں جھنکار کی آواز
پرکالہ دل گریہ سرشار نے کھینچا

نقشہ نہ کھینچا خواب پریدہ کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدہ بیدار نے کھینچا

ایسی ہے ترے ہاتھ کے بوسوں کی تمنا
اس شوق میں چلہ لب سوفار نے کھینچا

شق القمر انگلی کے اشارے سے دکھایا
قشقہ جو بت آئینہ رخسار نے کھینچا

کن کن ثمروں کو قد موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو موئے کمر یار نے کھینچا

بگڑے کبھی چٹکی ہی سے گیسوئے شب عشرت
نالہ کبھی پازیب کی جھنکار نے کھینچا

چھپ چھپ کے کبھی رویا تو گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں غم دلدار نے کھینچا

میرا دل پر داغ ہے افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

مجنوں کو مری وحشت نے دی یہ حسد سے
کانٹا جو چبھا پاؤں میں خوددار نے کھینچا

جب آہ کی آثار سحر کے نظر آئے / سورج کی طنابوں کو دل زار نے کھینچا
چھالوں نے مرے پاؤں کو آنکھوں سے لگایا / دامن کو مرے دشت کے سر خار نے کھینچا
پھر تم مجھے کہنا نہ کبھی مرشد منصور / نعرہ نہ انا الحق کا اگر دار نے کھینچا
جو رنگ لگانے کا جو ابرو کو ہوا شوق / آہوئے حرم طرۂ طرار نے کھینچا
لی ابر بہاری نے پر زاغ کی رنگت / نقشہ دم طاؤس کا گلزار نے کھینچا
گریہ کا تعلق مری پلکوں سے عجب ہے / سیلاب کا دامن نہ کبھی خار نے کھینچا
خورشید سحر گاہ کا جب تک نہ کیا خون / نقشہ بھی نہ ہنہ و شب تار نے کھینچا
لہرانے لگا خون جگر نوک مژہ پر / گلزار کو خار سر دیوار نے کھینچا
تو راہزن سعی تھا او آبلہ پا / اچھا ہوا سعلی یہ تجھے خار نے کھینچا
ہو مے گلرنگ سے ہا شب کو یہاں تک / آغوش میں بیہوش کو ہشیار نے کھینچا
سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر / نالہ جو کسی دن ترے بیمار نے کھینچا

۵۰

باور سخن غیر کو فرہاد نہ کرنا / سمجھاؤ گے ایسا کہیں استاد نہ کرنا
صدمہ ہوں کا گلا اے دل ناشاد نہ کرنا / جلاد کو چاہا ہے تو فریاد نہ کرنا
گیسو سے رہا تم دل ناشاد نہ کرنا / اب دام میں لائے ہو تو آزاد نہ کرنا
یہ تو نہیں کہتا میں کہ بیداد نہ کرنا / ہاں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرنا
بھولا نہیں فرقت کا زمانہ مجھے اب تک / وہ میرا تڑپنا وہ ترا یاد نہ کرنا

وہ خاک اڑانے کو تو آئے سر مدفن
اور میں یہ کہوں خاک کو برباد نہ کرنا

چٹکی ہے کلی کوئی نہ کوئل کوئی کوکی
نالہ ابھی اے مرغ چمن زاد نہ کرنا

ہم سے وہ اس اقرار پہ کرتے ہیں ملاقات
ہم ظلم کریں تم پہ تو فریاد نہ کرنا

تا دیر تڑپنے میں مزہ آتا ہے مجھ کو
تو قتل میں جلدی کہیں جلاد نہ کرنا

سمجھو یہی جادہ ہے بزرگان سلف کا
دیکھو مرے اشعار پہ ایراد نہ کرنا

بندہ تو اس اقرار پہ بکتا ہی ترے ہاتھ
لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

او وعدہ خلاف اپنے تغافل کی قسم ہے
تا عمر مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنا

اے نظم عجب لطف ہے دیوانہ دلی میں
ہاں ترک کبھی عشق پریزاد نہ کرنا

۵۱ — فعلاتن مفاعلن فعلات — ۱۶

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا
اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

اف نہ کی آزما کے دیکھ لیا
تم نے چھریاں لگا کے دیکھ لیا

دل کو تلووں سے مل کے وہ بولے
کیوں مزا تلملا کے دیکھ لیا

دیکھ سکتے تھے آنکھ سے نہ جسے
اس کو دل میں چھپا کے دیکھ لیا

پھول سے ہیں سبک قدم اس کے
میں نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

حال اس شوخ نے مرے دل کا
کیا نظر میں سما کے دیکھ لیا

مجھ پہ احسان ہوا نزاکت کا
تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھنا ہی نہ تھا ادھر دل زار — تیرے کہنے میں آ کے دیکھ لیا
دھجیاں آستیں کی کہتی ہیں — ہاتھ بیجا بڑھا کے دیکھ لیا
مر گیا میں سمجھ کے سچ اس کو — کیوں بہانہ بنا کے دیکھ لیا
ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں — ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا
کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت — ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا
کچھ کروائی ہی سی کرتا ہے — دل کے ٹکڑے اڑا کے دیکھ لیا
نزع میں بھی ملا ہو نامہ یار — اُٹھ کے بیٹھا اٹھا کے دیکھ لیا
دل کی چوری بھی کھل گئی اب تو — آنکھ تم نے چرا کے دیکھ لیا

نہ ہوا داغؔ کا جواب اے نظمؔ
طبع کو آزما کے دیکھ لیا

کام آخر نہ ہونا تھا نہ ہوا — فکر کاہے کی اب - ہوا نہ ہوا
خاک پا ہو کے نقش پا نہ ہوا — تیرے قدموں سے میں جدا نہ ہوا
دل تو دیتا ہے تو مجھے یارب — اور اگر درد آشنا نہ ہوا
حسن اس کا نہ آنکھ دیکھ سکی — سات پردے تجھے سامنا نہ ہوا
ہم کو کہنا تھا جو وہ کہہ گزرے — دل میں قائل ہوا وہ یا نہ ہوا

۱؎ زمین انہی مرحوم کی نکالی ہوئی ہے ۱۲

تو نے روزِ الست حیف اے نظمؔ
وعدہ تو کر لیا وفا نہ ہوا

۵۲ ولہ ۱۶

دم گیا شوقِ جستجو نہ گیا
دل گیا داغِ آرزو نہ گیا

ہاتھوں کی صفا سے شرما کر
آئینہ اس کے روبرو نہ گیا

کہیں ہوتے ہیں سنگ دل ایسے
رحم دل میں تمہارے چھو نہ گیا

لے اوڑا مرغِ نامہ بر مکتوب
دلِ بیتاب ساتھ تو نہ گیا

خاک میری رہی صبا کے ساتھ
مر کے بھی شوقِ جستجو نہ گیا

گھونٹ ڈالا گلا گریباں نے
دستِ کوتاہ تا گلو نہ گیا

خلد میں خاک پھر ملے گا لطف
ساتھ جب ساغر و سبو نہ گیا

تھا جو مجھ کو لحاظ قاتل کا
اُڑ کے دامن تلک لہو نہ گیا

پی کے مے شیخ ہو گیا بے خود
پھر بھی تقویٰ رہا وضو نہ گیا

ولولے وہ رہے نہ جوشِ شباب
ہائے اک جوشِ آرزو نہ گیا

تا کمر پہنچے طرۂ سنبل
مثلِ گیسوئے مشک و بو نہ گیا

میری آغوش کی سی شکل جو تھی
شرم سے وہ کنار جو نہ گیا

کسی محفل میں وہ بہارِ حسن
بے طلسماتِ رنگ و بو نہ گیا

مر رہا آ کے میں ترے در پر
ٹھوکریں کھانے کو بکو نہ گیا

اڑ رہا ہوں غبار ہو ہو کر | زورِ پرواز جستجو نہ گیا

نظم اس سال بھی زیارت کو
جانے والے تھے لوگ تو نہ گیا

۱۲ ۹۴

خیال و خواب سا گذرا نظر مثلِ سراب آیا
یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہدِ شباب آیا
کہاں اے نظم لے کر کاروانِ صبر و تاب آیا
جہاں سو بار طوفاں موج خیز اضطراب آیا
شبِ غم میں ستاروں کے لئے روزِ حساب آیا
مری اختر شماری کو سمجھتے ہیں عذاب آیا
سحابِ تیرہ لے کر خیمۂ مشکیں طناب آیا
اور اس ظلمات میں ساقی نہ لے کر آفتاب آیا
عبث کی گردشِ افلاک نے گہوارہ جنبانی
نہ دل ٹھہرا نہ غم بھلا نہ موت آئی نہ خواب آیا
نکل اے جانِ مضطر میں بھی اب بھی ہمنشیں تیرا
ٹھہر اے عمرِ رفتہ میں بھی تیرے ہم رکاب آیا
فلک اندر فلک ہے کائناتِ اس بزمِ عالم کی

مے عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا

جواہر ریز ہے گردوں طرب انگیز ہے ہاموں
شفق سے شیشہ شبنم میں یاقوت مذاب آیا

قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہ کر
میں اب جھک جھک کے چلتا ہوں کہ سن لوں کیا جواب آیا

شب غم میں نہ پوچھو دم نکلنے میں ہے کیا لذت
اجل اس طرح سے آئی کہ میں سمجھا کہ خواب آیا

رہے قسمت تہ خنجر کیا جی بھر کے نظارہ
نہ بسمل کی پلک جھپکی نہ قاتل کو حجاب آیا

نہ جا میخانہ میں اے نظم ہم تجھ سے نہ کہتے تھے
وہاں سے ہو کے تم بیہوش و سیہ مست و خراب آیا

حرف (ب)

۵۵

اٹھا ہوں مثل گرد قدم کی صدا سے کب
اٹھتا ہے احتیاج کا داغ التجا سے کب
سختی کو جھیل جا تو سعادت شکار ہے
ہرگز گھٹا نہ عشق رہ مستقیم کا

۱۵

پاؤ نگا قافلہ کا پتہ نقش پا سے کب
او ہرزہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب
خالی ہے اس پہاڑ کی چوٹی ہما سے کب
سرکا یہ آفتاب خط استوا سے کب

کب ہوگا برطرف غم و اندوہ اے کریم
پانی سفید پر ہوگا کالی گھٹا سے کب

فریاد کس سے کیجئے گردوں کے دور میں
نکلی پسے ہوؤں کی صدا آسیا سے کب

تو بھی تو ہمکلام تھا اے شوق کوئی بار
پیچھے میں رہ گیا ہوں صدائے درا سے کب

ہوتی ہی آبرو کو ہو کیا حرص میں فروغ
اٹھتی ہے موج آب گہر میں ہوا سے کب

ہے اس طرف ہر ایک رگ جاں کھنچی ہوئی
یہ ربط کاہ کو ہے بھلا کہربا سے کب

پہنچی ہی ٹھیک وقت یہ میخانہ تک گھٹا
کیا جانئے چلی تھی یہ کوہ صفا سے کب

دو نرخ ہی ہیں گرا ہیگا لیجائے نفس شوم
یہ پوچھتا ہی راہ کسی رہنما سے کب

کیا جانئے کب طلسم خودی سی نجات ہو
نکلے یہ عکس آئینۂ ماسوا سے کب

ہم کو بقائے نام کی بھی کیوں ہوس نہ ہو
دھویا تھا ہاتھ خضر نے آب بقا سے کب

جب دل کو ظلم سہنے میں آنے لگا مزہ
توبہ وہ کرنے بیٹھی ہیں جور و جفا سے کب

نکلے گا دل سے نظم کے کیونکر غم حسین
جاتا ہی رنگ لعل سی سرخی حنا سے کب

۶۵ — وله — ۹

کوئی مے دے یا نہ دے ہم رند بے پروا ہیں آپ
ساقیا اپنی بغل میں شیشۂ صہبا ہیں آپ

غافل و ہشیار رو و تمثال یک آئینہ ہیں
ورطۂ حیرت میں ناداں آپ ہیں دانا ہیں آپ

کیوں رہے ہے میری دعا منت کشِ بال ملک
نالۂ مستانہ میرے آسماں پیما ہیں آپ
ہے تعجب بخضر کو، اور آبِ حیواں کی طلب
اور پھر عزلت گزینِ دامنِ صحرا ہیں آپ
منزلِ طولِ املِ درپیش اور مہلت ہے کم
راہ کس سے پوچھیے حیرت میں نقشِ پا ہیں آپ
حق سے طالب دید کے ہوں ہم بصیرا سے ہیں
ہم کو جو کوتہ نظر سمجھیں وہ نابینا ہیں آپ
گل ہمہ تن زخم ہیں پھر بھی ہمہ تن گوش ہیں
بے اثر کچھ نالہائے بلبلِ شیدا ہیں آپ
حرص سے شکوہ کروں کیا ہاتھ پھیلانے کا میں
کہتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خلق میں رسوا ہیں آپ
ہم سے اے اہلِ تنعم منہ چھپانا چاہیے
دم بھرا کرتے ہیں ہم اور آئینہ سیما ہیں آپ

حرف (ت)

۱۴ ۵۷

سلہ دم لے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے ۱۲

سخن میں ہے گہر آبدار کی صورت | قلم میں ہے رگ ابر بہار کی صورت
عدم کا خواب بھی نرگس کو خواب نوشیں تھا | کہ آنکھ کھولکے دیکھی بہار کی صورت
طواف کیجئے اس آستاں کا جس و سے | ہوئی فلک کے لئے روزگار کی صورت
قسم یہ دے کے چلی ہو کہ بیقرار نہ ہو | بتائے جائیے دل کے قرار کی صورت
ہلال عید کو میں دشنۂ قضا سمجھا | کہ چاند دیکھ کے دیکھی رخ یار کی صورت
ترے فراق میں لیں میں نے کروٹیں تا صبح | نہ بن پڑی کوئی لیکن قرار کی صورت
خدا دکھائے نہ دشمن کو بھی وہ کالی رات | بہت بری تھی شب انتظار کی صورت
خدا کا فضل ہے ملک دکن کے شامل حال | برس پڑے کہیں ابر بہار کی صورت
کبھی فراق میں تارے گنے کبھی گھڑیاں | نظر میں پھر گئی روز شمار کی صورت
بس انتظار جو کھینچا تو میری آنکھوں میں | کھچی ہوئی ہے ترے انتظار کی صورت
ہر ایک برگ خزاں دیدہ ہے وہ آئینہ | کہ جس میں دیکھ رہا ہوں بہار کی صورت
نہاں ہے فیض کا چشمہ بھی خاکساروں میں | کہ ابر کا ہے ہیولا غبار کی صورت
شگفتہ ہے گل تر کی طرح سے شعلہ شمع | حریر شعلہ سے ظاہر ہے خار کی صورت

ہمیں کو دخل سفینہ سیہ میں تھا اے نظم
رہی نہ ہائے وہ لیل و نہار کی صورت

۵۰ ———————— ت

کرتا ہے ظلم و جور یہ چرخ کہن بہت | دل مل گئے ہیں خاک میں گل پیرہن بہت

اک مشت استخواں پہ گنہ ہوں کا بوجھ ہاے
تھا اس نحیف و زار کو بار کفن بہت

نقش چمن میں غفلت اہل جہاں کا ہے
اترا رہے ہیں پھول پہن کر کفن بہت

ہم کو بھی مل رہیگی کسی سے سخن کی داد
جو ہر شناس سیکڑوں ہیں اہل فن بہت

٥٩ ٣٧

ولہ

پرتو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است
شور ما و من بہ بزم ما سوا افتادہ است

آئینہ در ورطہ از جوش صفا افتادہ است
طبع روشن ہر کہ میدارد زپا افتادہ است

کوچہ زلف و شب دیجور در رہ تاریک و تار
دل بیفتاد و نمیدانم کجا افتادہ است

شکوہا دارم ز انداز گران جانی خویش
ہست چوں سنگے کہ در راہ وفا افتادہ است

کشتی صبرم بطوفان ہوا افتادہ بود
بر کنار اینک بہ موج بوریا افتادہ است

سایہ بر خورشید افتادست از زلف سیاہ
شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است

انس بگرفتم زبس با خانہ ویرانی خویش

سبزۂ بیگانہ با من آشنا افتادہ است

شرمسارم عذر بدتر از گناہ آوردہ ام
پردہ بر روے من از دستِ دعا افتادہ است

شور یارب بر لب و دست تظلم بر فلک
شیشۂ صبر من از بام دعا افتادہ است

من ہمہ تن گوش باشم بر صدائے الرحیل
دو دو چشم گرد آواز درا افتادہ است

ماندگی پائے من سلسے کہ بر من بستہ بود
بر سرم از صدمۂ شور درا افتادہ است

برق را گفتم مجو از ہستی راہ گریز
از میانِ جست و در آغوش فنا افتادہ است

چوں الف آہے کشم و ز ہستی خود بگزریم
در کمند وحدتم صید فنا افتادہ است

گردشِ نہ آسمان و یک دلِ نالانِ من
دانہ ہست و بدستِ آسیا افتادہ است

انقلابِ چرخ نتواند مرا از جا برد
من دلے دارم کہ قطبِ آسیا افتادہ است

باز آمد تشنه کام از بسکه اسکندر بدید
حیف اندر چشمهٔ آب بقا افتاده است

نسبتی دارد حدوث دهر با لوح قدم
همچو آن نقشی که بر آب بقا افتاده است

هر قدر نزدیک تر آید بگردد دور تر
سالک راهش بره چون نقش پا افتاده است

سرنگون گشتم ز پیری من کجا و فکر شعر
طرز مضمون بلندی پیش پا افتاده است

سید هر جام فنا بر کف صلا ضحاک دهر
دور جم آخر شد و نوبت بما افتاده است

نقد فرصت را بیغامی برد نفس حریص
حیف ازین دزدی که در کالا بما افتاده است

ناروائی هست آذین دکان اهل فن
نقد معنی چون متاع ناروا افتاده است

کهکشان با کج روی تا آسمانها سر کشید
بر زمین چون نظم خط استوا افتاده است

بسکہ جوشِ اضطراب شوق برقِ خرمن است
تا تو دریا بی مرا من نیستم خاک من است
از غم عشقش بپا سا گم نہ این کار من است
خوش بیفروزیم آتش تا ہوا در دامن است
تا مرا تابِ توان و ہوش خرمن است
جملہ وقف انتظار و شوق برق ایمن است
از کواکب بر سرِ ما ریخت گردِ فتنہا
چرخ گرداں آسیا ہم ست و ہم پرویزن است
وہم ہستی بسکہ چشمت را غبار آلود کرد
تا تو می بینی مرا من نیستم گرد من است
موسیا وا رفتگاں گفتگوئے یار را
در صدائے لن ترانی موج برق ایمن است
کاروان اشک خون زین رہ گذر بگذشت دوش
نقش پایش از سر موئے مژہ تا دامن است
نکہت گل را بگفتم رخ ہمی پوشی چرا
گفت محجوبم مرا خوں وفا بر گردن است
از ہجوم ظلمت اندوہ و غم مضطر مباش

بعد شب صبح ست و بعد از صبح روز روشن ست

ما سراغ حق همی گیریم از نامحرماں
کاندریں وادی چراغ راہ چشم رہزن ست

درس عبرت را ازیں پیر طریقت یاد گیر
چنگ در بزم طرب محو فغاں و شیون ست

میکشد در رہ ترا ایں سعی بیجا اے سپند
نردبان دود دل کوتہ ز بام شیون ست

طے کند صد سالہ رہ از برگ گل تا آفتاب
بہر شبنم ایں کرامتہا ز قلب روشن ست

حاصل عمر عزیز از بہر تماشا سوختنی
نظم ایں جوش طرب رقص شرار خرمن ست

ولہ ۶۰

عشق از سوز دل من طرح آتش خانہ ریخت
اخگر از آتش گرفت و در دل پروانہ ریخت

کشتۂ آں ترک ستم کز سر ناز و غرور
کافرم پنداشت و خونم چو بیباکانہ ریخت

چارہ بے خوابیم ناید ز تو اے قصہ خواں

در دو چشم صد نمک وان شور این افسانہ ریخت
کرد چون خورشید تیغ خونچکانش در نیام
چرخ از شب دام بگشاد و زر اختر دانہ ریخت

١٦ وله ٦١

هوس برغم خرد و مدعائے دیگر داشت
صوابدید دگر بود رائے دیگر داشت

اگرچہ خضر رفیق طریق بود ولے
سلوک منزل دل رہنمای دیگر داشت

نہ گشتہ ایم مکدر ز صدمۂ نفسے
کہ آب آئینہ ما صفائے دیگر داشت

جہانست صفحۂ اعمال مرد دانستم
کہ لغزش قدمم نقش پای دیگر داشت

صعود کردم تا لامکان و برگشتم
کہ گوشۂ دل روشن فضای دیگر داشت

دلم اگرچہ بخود ہرچہ کرد بد کردست
ولے خیال نکوئی بجائے دیگر داشت

مگو کہ نالہ کشیدیم و بر نخواست صدائے
شکست گنبد مینا صدائے دیگر داشت

ز کنج صومعہ این جا رسیدہ برخوردم
کہ کنج میکدہ آب و ہوائے دیگر داشت

بجرم عشق تو کشتی مرا و شاد شدم
چرا کہ کشتہ تو خونبہائے دیگر داشت

مپرس حال ز خود رفتہ براہ فنا
کہ جادۂ دگر و نقش پائے دیگر داشت

بہ زعم من ہمہ بودیم طالب رہ دوست
براہ فتنہ فتادن بہانۂ دیگر داشت

بہ بزم عیش منہ دل بہ شکوہای فراق
حکایت شب غم ماجرائے دیگر داشت

بوہم رشک برفتیم و بازگردیدیم
کہ راہ کوچہ او نقش پائے دیگر داشت

متاع هوش بباد فنا بداد و گذشت | مگر پریدن رنگم هوائے دیگر داشت
به پند ناصح ناداں که گوش ننهادم | کلام او سخن نا روائے دیگر داشت

٥ —— فریب نغمهٔ بلبل نخورده ام ای نظم
ز خامه ام نفس مشک سائے دیگر داشت

٦٢ —— ١٢

ز کنه واجب او ار هیچ نتوان گفت | هر آنچه گفت کسی با حد امکان گفت
غم تو در دل من آنچه گفت پنهان گفت | بیان جمع ندانم چه چشم گریان گفت
هر آنچه گفت گل از خواب خود پریشان گفت | ز بزم گلکده تریان زبان برق و خندان گفت
به شاهراه طلب ذوق سعی را نازم | که مشکلے که برد عرض کرد آسان گفت
ورود لشکر و وادی نمل و مور ضعیف | ز هیبتش نتوان هیچ با سلیمان گفت
امان ز باد فنا نیست در حصار سپهر | چراغ مهر شنیدی چه زیر دامان گفت
چه خواست تیر نگاهش ز من نه دانستم | که هرچه گفت مرا از زبان پیکان گفت
زهے مروت ابر و زهے استغناش | صلا بخوان کرم برکشیده امان گفت
ز عشق ضبط فغان طرفه لذتے دارد | حکایتے ست که نتوان شنید و نتوان گفت
غزل اگرچه بگلبانگ بلبلے ماند | هزار نکته درد و شاعر سخندان گفت
حکایتے ز تماشائے بزم و حاصل دید | که شمع کشته نگفت از زبان مژگان گفت
کسے چه گوش نهد بر بیان نظم بحشر | که خواب هستی خود گفته و پریشان گفت

۶۳ — وله — ۱۱

کامگار است هرکه ناکام ست | زانکه گیتی طلسم اوهام ست
بدمگو هرکه را که بدنام ست | نام او خود بجائے دشنام ست
فال باده کشی مزن واعظ | خط پیمانه حلقهٔ دام ست
دین و دنیا بهم نخواهد رفت | طمع هست و سر بسر خام ست
انفعال گناه و حسرت دید | چشم بر پاء و جلوه بر بام ست
گرد بادیم در راه کوچهٔ دوست | نیت ما طواف و احرام ست
آستانش کجا و سجدهٔ ... ما | بوسهٔ عاشقاں به پیغام ست
اصل گیتی ست جوش بادهٔ عشق | کهکشاں حلقهٔ خط جام ست
جست ازجا سپند و رمزے گفت | کز عدم تا وجود یک گام ست
بنده آں کسم که در عالم | نیک کردار و نیک فرجام ست
نظم دانسته ام با عمر سپهر | صبح آغاز و شام انجام ست

۶۴ — قطعه — ۵

مرکب ماست کوکب سیار | از مسیرش سنین و اعوام ست
او درین راه خویش غلطنده | شام تا صبح صبح تا شام ست
تا هلال از هلال یک منزل | تا صباح از صباح یکگام ست

که قریب است و گر بعید از شمس | قرب و بعدش فصول ایام ست
هرچه بینیم ما همی بینیم | که زمین فرش و آسمان بام ست

۶۵ —— شاه و صدر اعظم بهادر —— ۹

دل همه زخم و دو زلفش شکن اندر شکن است | در خم هر شکنش نافهٔ مشک ختن ست
نوبهار است و پری خانه به مینا دارم | جنبش بال پری موج شراب کهن ست
رفت عمرم و ز چمن دور و اسیر قفسم | در دلم نقش هواخواهی سرو و سمن ست
خواستم نافه ز زلفش بگشایم در باغ | گفت هشیار که غماز نسیم چمن ست
بسکه بگرفته دلم از صحبت ابنای زمان | بر سرم گرد غریب الوطنی در وطن ست
ابر بر کوه هی عمر تو می گرید زار | برق از این ره که تو غافل گذری خنده زن ست
قرنها بود زمین غرق بخون ناحق | شاهد راز درون لاله خونین کفن ست
غزل شاد که سلکش گهرش می گویند | شهرهٔ حسن قبولش ز دکن تا عدن ست
برتری از دگران اهل سخن راست بجا | جوهر ذاتی انسان سخن است و سخن

۶۶ —— وله —— ۷

آورد عرض بار امانت چنان شکست | پشت سپهر تا کمر کهکشان شکست
موج چو سیل سر زده از قلزم شهود | در وادی سپهر کران تا کران شکست
سوز فراق و گریه شبهای تار حیف | بنیان شمع از سره تا استخوان شکست
پیر مغان براه کرم جرعه بداد | کز مے خمار هستی من جاودان شکست

خم گشت پشت مرد و بدل آرزو بماند — ترکش ہنوز ناشده خالی کمان شکست
این قید و بند بود که مرغ روح من — تا من رہا شدم قفس استخوان شکست
مرغے بہ پیش ابرہہ رفت و صدا نکرد — کز سنگ ریزه گردن پیل دمان شکست

۶۷ — ۱۹

حرف ح

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح — لوٹ جاؤنگا میں داماں کیطرح
پاؤں پھیلائے ہیں داماں کیطرح — ہاتھ کھینچا ہے گریباں کیطرح
چل گیا مجھ پہ یہ دو دھار اخنجر — پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کیطرح
تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم — توڑ ڈالا جسے پیماں کیطرح
سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے — تیغ آئی تیرے احساں کیطرح
میرے غماز کا ہے منہ کالا — میرے ہی نامۂ عصیاں کیطرح
کھاتے ہیں ترک محبت کی قسم — ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ قرآں کیطرح
اے قناعت ترے صدقے ہو جاؤں — میں ہوا پر ہوں سلیماں کیطرح
پر کدورت ہے دل زار ایسا — خاک اوڑتی ہے بیاباں کیطرح
مجھ کو حیرت ہے کہ خورشید بھی ہے — زرفشاں جلوۂ عثماں خلد اللہ ملکہ کیطرح
نظم کے پاس تھا کیا دل کے سوا — کھو دیا اس کو بھی ایماں کیطرح

کیا تھا ابر نے نالہ میری فغاں کیطرح ۔ زمیں نکل گئی قدموں سے آسماں کیطرح
الہی آج کا ابر اسقدر تو جھک آئے ۔ کہ ڈھانک لے در میخانہ سائباں کیطرح
دکھا رہی ہے مجھے بیخودی نیا عالم ۔ جو اس زمیں کیطرح ہے نہ آسماں کیطرح
کوئی نشاں نہ ملا کسطرف گئے احباب ۔ بھٹکتے رہ گئے ہم گرد کارواں کیطرح
نزول رحمت باری ہے آج کثرت سے ۔ کہ ابر کشتی مے پر ہے بادباں کیطرح
دل و جگر کبھی کاہیکو یوں تڑپتے تھے ۔ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی سناں کیطرح
جہاں میں صاحب ہمت کی یہ نشانی ہے ۔ عروج پائے جھکے سر آسماں کیطرح
سوا نمود کے ہستی دہر کچھ بھی نہیں ۔ یہ حلقہ ہیچ سے خالی ہے کہکشاں کیطرح

٦٨ ۔ ١٠

اس مہینہ بھر کہاں تھا ساقیا اچھی طرح ۔ آ ادھر آ عید تو مل لیں ذرا اچھی طرح
انگلیاں کانوں میں رکھکر اے مسافر سن ذرا ۔ آ رہی ہے صاف آواز درا اچھی طرح
چشم موسی لاسکی کب اوسکی جلوہ کی نہ تاب ۔ چشم دل سے جسکو دیکھا بارہا اچھی طرح
فاصلہ ایسا نہیں کچھ عرش کی زنجیر سے ۔ کیا کہوں اٹھتا نہیں دست دعا اچھی طرح
اہل صورت کو نہیں ہے اچھی سیرت سے غرض ۔ اچھی صورت چاہئے اچھی ادا اچھی طرح
شاہدان لالہ و گل کی خبر لائی ہے کچھ ۔ سال بھر کے بعد آئی ہے اے صبا اچھی طرح
سیکھ لیگی بل کی لینا تا کمر آنے تو دو ۔ بل ابھی کرتی نہیں زلف دوتا اچھی طرح
شیشہ و جام و سبو بھر لے مے گلرنگ سے ۔ آج ساقی گھر کے آئی ہے گھٹا اچھی طرح

لیتی ہیں اہل جنوں کیا کیا تصور کے مزے
آنکھ سی پریوں کو دیکھا بارہا اچھی طرح

دے رہی ہے اسکی خاموشی صدائے دور باش
یہ نہیں کہتا کہ نظم مبتلا اچھی طرح

حرف خ

۶۹ — ۱۲

سمجھا ہوں عیش و طیش جہان خراب تلخ
ہے جام واژگوں میں فلک کے شراب تلخ

دنیا کو آنکھ بھر کے نہ تھا دیکھنا تجھے
ہستی کا ایک جام بھی ہے اے حباب تلخ

پیری سی پڑھ کے عہد کوئی بے مزہ نہیں
شیریں تھا گر زمانۂ طفلی شباب تلخ

آیا تھا باغ دہر میں کیا جانتا تھا میں
کرے گا زندگی دل خانہ خراب تلخ

پیتا ہوں دُرد گدلا کے تو بڑھتی ہے تشنگی
پیاسا سا کنار بحر ہوں میں اور ہے آب تلخ

بے منت حریف جو حاصل نہ ہو سکے
ہے شیر ناب بے مزہ اور شہد ناب تلخ

سمجھو نہیں کس طرح سے کہ شیریں ہے تیغ لب
میں نے تو ہر سوال کا پایا جواب تلخ

ناصح فسانہ کہنے میں اگلا ہی تو نے زہر
سُن سُن کے ہو گیا مری آنکھوں میں خواب تلخ

اک دل جو ہے اداس تو محفل اداس ہے
جام شراب تلخ ہے شور رباب تلخ

سمجھا ہوں جو کہ جنت و دوزخ سی ہے مراد
یعنی کہ ہے کرم ترا شیریں عتاب تلخ

پوچھو زبان شمع سی کیونکر ملا فروغ
ہوتی ہے جانگدازی راہ صواب تلخ

اے نظم جانتا ہوں فریب جہاں کو میں
پیاسے کے ہے مذاق میں موج سراب تلخ

۷۰ ۱۱

حرف د

نظر پڑا جو مجھے دام شک بو صیاد
ہوئی ہے دل کو اسیری کی آرزو صیاد

نہ بوئے گل سے غرض ہے نہ صوت بلبل سے
نہ باغباں سے ہے مخالفت ہے عدو صیاد

چمن میں خوف اسیری کا ہر طرف تھا ہجوم
نکل سکی نہ مرے دل سے آرزو صیاد

یہ آرزو بھی نہ پوری ہوئی اسیری کی
سنائیں اپنی کہانی سنے جو تو صیاد

جو گل فروش ادا ہے تو بوسہ ہی بیچیں
وہ آج صید میں اور جوش آرزو صیاد

کیا ہے نطق اسیری نے مست بلبل کو
قفس ہے کیا مئے گلرنگ کا سبو صیاد

لپٹ گئے سرو سے قمری یہی تو کہتی ہے
تری تلاش میں پھرتے ہیں کو بکو صیاد

گرہ ہوئی ہیں رگیں دست جا بجا نالے
گلوئے نے کی طرح ہے مرا گلو صیاد

قفس میں یاد چمن کی یہ گل کھلاتی ہے
بنا ہے لالہ و گل خون آرزو صیاد

فغاں کر کے گھٹ گھٹ کے ہیں تمام ہوا
گلے کی ہوگئی پھانسی رگ گلو صیاد

ہمیں تو اپنی رہائی سے یاس ہے نظم
کرے غضب کا فسوں ساز و حیلہ جو صیاد

۷۱ ۱۰

آئینہ از پر تو او وادی ایمن شود
چشم آہو از نگاہش دیدہ روزن شود

حیف ازاں ساعت کہ خود نفس تو آہرمن شود
خوشتر آں کس کو رہا از بند ما و من شود

عشوہ او تیغ چوں بر من کشد ہنگام وصل
از دو گیسویش گرہ بکشایم و جوشن شود

اے کہ شمع مدفنم گشتی توقف کن کہ تا
شمع کشتہ باز از سوز دلم روشن شود

اف ازیں سوز نہانیہا کہ دل را خاک کرد
ہمچوں آں پرکالہ آتش کہ در گلخن شود

نیست امکاں مفر از کوچہ گیسوے او
جادہ بر خود پیچد و چوں افعیم رہزن شود

مایہ صد گمرہی باشد دل صد آرزو
رہگزارش را چراغ از چشم آہرمن شود

کس نمی پرسید از حال من اے برق بلا
خندہ بر من زدی اے چشم تو روشن شود

بادیہ گردی من پوشید عریانی من
گرد رہ در رہ قدم برخیزد و دامن شود

لذتے دارم چناں از کاوش مژگاں تو

بشکنم نشتر بدل گر ناله شیون شود

۷۲ — ۱۲

جوش سرشک تا سر مژگان نمی رسد
و از خون دیده گل بگریبان نمی رسد

بالاترست جلوهٔ او از فراز عرش
آنجا نگاه موسی عمران نمی رسد

تا آنکه خود فنا نشود در رهِ طلب
شبنم به اوج نیّر تابان نمی رسد

ابر سیاه در نظر جذب شوق ماست
این گرد سرمه تا به صفاهان نمی رسد

زنجیر عرش هست و ندانم ز بهر چیست
آنجا که دست سلسله جنبان نمی رسد

دیدند اهل دل ثمر قدکشی سرو
آری سر غرور به سامان نمی رسد

تا دست و پا بموج تبسم نمی زند
طفل شگوفه تا گل خندان نمی رسد

ور کاروان دهر ببندند یوسفی
از چه برآمدست و بزندان نمی رسد

دامن کشان گذشت سر کشتگان خویش
دستش کسے بگوشهٔ داماں نمی رسد

ماییم و طوف دشت و بیابان چو گردباد
وین خاک ما عمر گریزاں نمی رسد

بے راهبر مباش که این کاروان گل
بے سعی نامیه به گلستان نمی رسد

هرچند تیز گرد بود دانهٔ شبه
اما بآب گوهر غلطان نمی رسد

بدام این نفس از افسون نه از افسانه می آید
چنین کار سترگ از همت مردانه می آید

بیک اشک ندامت مزرع اخلاص شاداب است
سر شاخ مژه خرمن بدوش این دانه می آید
دہد تا مژده جام صبوحی مے پرستاں را
بیک شب گیر ابر از کعبه تا میخانه می آید
اگر ضبط نفس شرط است در میخانه عرفاں
کر بے قلقل شراب از شیشه در پیمانه می آید
عیاں از اهتزاز شعله شمع است ایں معنی
هوائے خوش زباں افشانی پروانه می آید
براه دوست عاشق از سر جاں بگذرد آرے
بسر غلطیدنی از گوهر یک دانه می آید
فغاں از مستی ساقی که دیدم گشتی مے را
کنار جو بموج لغزش مستانه می آید
دریں زنداں تن از دم شمرد نهانیاسایم
نسیم جاں فزا از کوچه جانانه می آید
سزد گر سر کشد از بندگی نفس
بشر در عالم ایجاد آزادانه می آید
ز حال خود گذشتن نیست کار باده پیمایاں

که جوشِ باده ایں جا تا خطِ پیمانہ می آید
بگردوں تیرہ ابرے بر شد و مستند میخواراں
که پندارند بردوش ہوا میخانہ می آید
ز احوالِ سویدائے دلِ مضطر چہ می پُرسی
که چوں اسپند در پرواز بیتابانہ می آید
ز پاسِ وضعِ رنداں نگزرم تا اندریں محفل
اقامت از صراحی گردش از پیمانہ می آید
فروغِ حُسن را شد ناگزیر اسبابِ رُسوائی
که ہر جا شمع روشن می شود پروانہ می آید
کلامِ بے ہنر کز گنجِ معنی ہست بے بہرہ
صدائے بوم را ماند که از ویرانہ می آید
نمی آید ز ہر کس رام کردن نفسِ سرکش را
چنیں کارے ستُرگ از ہمتِ مردانہ می آید
تراشش تا کنم اے نظمؔ از دل گریہ مینا
بگوشِ من صدائے خندہ پیمانہ می آید

حرف ر

فاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

۲۶ ۷۴

نگاہِ ناز سے بسمل گر نکلے بسمل پر
یہ وہ خدنگ ہے آتا ہی چھوٹتے دل پر

نظر ٹھہرتی نہیں روئے یار کے تل پر
چمک رہا ہے ستارہ سا ماہِ کامل پر

جہاں کی لہر پہلی مصیبت ہے گردشِ فلکی
وہ تیز ہے کہ بھنور پڑ رہا ہے ساحل پر

پلک جھپکنے میں ہے منہدم بنائے جہاں
کھڑی ہوئی ہے عمارت یہ آنکھوں کے تل پر

نوائے شادی و غم دونوں میں تھی ہم دوش بلبل
کہ پس گیا گلِ نغمہ کفِ جلاجل پر

کیا تھا میں نے ابھی طے نہ وادیِ غربت
کہ پہنچی شامِ غریباں سوادِ منزل پر

ہمیں تو قلزمِ ہستی سے تھی عبور کی فکر
نہنگ بن گئی سر موج آ کے ساحل پر

ملی نہ غمکدہ دہر میں جگہ اتنی
کہ روؤں بیٹھ کے میں نامرادیِ دل پر

اوتر کے بام سے آیا نہ پھر وہ رونقِ بزم
وہ نور پھر کبھی اترا نہ شمعِ محفل پر

چلی ہے دہر میں کیسی ہوائے بیدردی
کہ ہو رہی ہے ہنسی نالۂ عنادل پر

تو ہم سے سیکھ لے اے قیس طرزِ بیتابی
اتار لیتے ہیں لیلیٰ کو چڑھ کے محمل پر

اولجھ کے دورِ تسلسل میں رہ گئی جو گلو
اونہیں ہے رشکِ سحر طوق اور سلاسل پر

پکارتی ہے یہ حسرت کہ ذبح کر کے مجھے
دیا ہے خون کا ٹیکہ جبینِ قاتل پر

جو یاد آ گئی ہے میرے دل کی بیتابی
پھڑک رہی ہے یہ وہ انداز مرغِ بسمل پر

نہ پوچھو قافلہ والو یہاں کا کوچ و مقام
کہ اک رکاب میں ہیں پاؤں یک منزل پر

یہ بے ثباتیِ سازِ طرب پکارتی ہے
کہ نغمہ رنگِ حنا ہے کفِ جلاجل پر

طوافِ شوق کو سیکھو انہیں پتنگوں سے
تڑپ رہے ہیں جو گر گر کے شمعِ محفل پر

نہیں مقام کا اس چلتی چھاؤں میں موقع
نہ بیقرار ہو مرنا پہنچ کے منزل پر

ملا طریق وفا میں جو کوئی سنگ گراں
اٹھا کے راہ سے میں نے وہ رکھ لیا دل پر

نگاہ ناز کا مطلب ہے کیا نہ کچھ سمجھا
چھری جگر پہ کوئی اب لگائے یا دل پر

ہزار شکر کہ افعال میں تو جبر نہیں
ہزار حیف نہیں اختیار ہے دل پر

لگا دے تیر کے پر مجھ کو بیقراری دل
کہ منہ سے [illegible] میں [illegible] جا لگے اپنی جان پر

ہے غبار کو جھٹکو نہ قافلے والو
کہ [illegible] پہنچ جائیگا یہ منزل پر

کسی کو قبر میں بھی پھر نہ پائیگا کوئی
کہ تین دن [illegible] ہیں مہمان پہلی منزل پر

قطعہ
کہاں وہ جلوہ گہ ناز تو کہاں اے
یہ آرزو تجھے اس حوصلہ پہ اس دل پر

۵۷ ——— فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ——— ۱۷

کوچہ کوئی نکلے جو رگ جاں کے قریں اور
اس گنبد بے در سے نکل جائیے کہیں اور

ہو سکتا ہے عالم میں جو ہو مہر مبیں اور
تجھ سا تو تصور میں بھی عالم کے نہیں اور

دل لیکے ستمگار ہوا بر سر کیں اور
دل جان تو دی کہ وہ بگڑے نہ کہیں اور

اللہ رے ساقی کا بجد ہو کے ملانا
کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

زاہد ہے مرے اور ترے سجدہ میں بڑا فرق
شوق اور ہوس اور ہے دل اور ہے دیں اور

کوثر پہ بھی زمزم پہ بھی گذرا ہے تو واعظ
دیکھے میں کہاں ہیں ہم سے خرابات نشیں اور

خط لیکے جو قاصد ترا آیا تو میں سمجھا
لائے ہیں صحیفہ کوئی جبریل امیں اور

اس چھیڑ میں کوئی جو تڑپتا ہو تو مر جائے
وعدہ ہے کہیں اور ارادہ ہے کہیں اور

او قاتل بے رحم کوئی وار ادھر بھی
محروم رہا جاتا ہے اک خاک نشیں اور

مر کر بھی ہمیں صور قیامت کا ہے دھڑکا
باقی ہے ابھی اک نفس باز پسیں اور

مرقد میں گڑا جاتا ہوں میں بار گنہ سے
جھکتا ہے جو گردوں تو دبی جاتی ہے زمیں اور

وہ داغ جو قسمت میں لکھا ہے نہیں مٹتا
گھستا ہے جبیں ماہ تو ملتی ہے جبیں اور

اڑنے میں لپکنے میں ہے شعلہ تر آنسو
ہے قہر کہ دیتا ہے ہوا دامن زیں اور

خوشبو سی یہی تھی جو شب وصل کی شب تھی
گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافہ چیں اور

کوچہ میں ہے تیرے غم عالم سے رہائی
پاتا ہوں ہوا اور فلک اور زمیں اور

تیر نگہ ناز نے کیا لغز تو ڈالا
میں ہوں کہیں بسمل جگر و دل ہیں کہیں اور

وہ محفل ارباب صفا ہو گئی برہم
ان لوگوں میں باقی ہے اب اک نظم حزیں اور

۷۶ —— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات —— ۱۵

احسان لے نہ ہمت مردانہ چھوڑ کر
رستہ بھی چل تو سبزہ بیگانہ چھوڑ کر

مرنے کے بعد پھر نہیں کوئی شریک حال
جاتا ہے شمع کشتہ کو پروانہ چھوڑ کر

ہونٹوں پہ آج تک ہیں شب عیش کے مزے
ساقی کا لب لیا لب پیمانہ چھوڑ کر

افعی نہیں کھلی ہوئی زلفوں کا عکس ہے
جائے کہاں یہ آئینہ و شانہ چھوڑ کر

طول امل پہ دل نہ لگانا کہ اہل بزم
جائیں گے ناتمام یہ افسانہ چھوڑ کر

لبریز جام عمر ہوا آ گئی اجل
لو اٹھ گئے بھرا ہوا پیمانہ چھوڑ کر

اس پیرزال دہر کی ہم ٹھوکروں میں ہیں
جب سے گئی ہے ہمت مردانہ چھوڑ کر

پھرنا ہمارا آپ میں آنا محال ہے
کوسوں نکل گیا دل دیوانہ چھوڑ کر

اونزا جو شیشہ طاق سے زاہد کا ہی حال
کرتا ہے رقص سجدہ شکرانہ چھوڑ کر

پر شمعۂ دریا تو نشانی ہے کفر کی
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ چھوڑ کر

زندان میکدہ بھی ہیں اے خضر منتظر
بستی میں آئیے کبھی ویرانہ چھوڑ کر

احسان سر پہ لغزش مستانہ کا ہوا
ہم دو قدم نہ جا سکے میخانہ چھوڑ کر

وادی بہت مہیب ہے بیم و امید کا
دیکھیں گے شیر پہ دل دیوانہ چھوڑ کر

رو رو کے کر رہی ہے صراحی وداع او
جاتا ہے دور دور جو پیمانہ چھوڑ کر

توبہ تو کی ہے نظم بنا ہو گی کس طرح
کیونکر جیو گے مشرب رندانہ چھوڑ کر

٧٧ ——— ١٥

بت کہتے ہیں کبھی کبھی تصویر دیکھ کر
سوجھی ہے دل لگی مجھے دلگیر دیکھ کر

للہ آئینہ سے بھی پردہ کیا کرو
ڈرتا ہوں میں نگاہ میں تاثیر دیکھ کر

پہلو سے دو گھڑی نہ سرکتے تھے جو کبھی
گھبرا رہے ہیں دفن میں تاخیر دیکھ کر

سایہ کے ساتھ دھوپ بھی شرما کے ہٹ گئی
زلفوں میں روئے یار کی تنویر دیکھ کر

عالم سے مجھکو صانع عالم کی یاد ہے
معمار کا خیال ہے تعمیر دیکھ کر

سمجھے مری دعا کو ملک نزد بان عرش
سہم صعود نالۂ شبگیر دیکھ کر

دوزخ میں اے کریم میں کیونکر گلہ کروں
تعزیر دی تو لائق تعزیر دیکھ کر

نالہ کی اپنے بے اثری یاد آ گئی
تڑپا میں صید کو ہدف تیر دیکھ کر

گردوں پہ ہے حداثت سن کا یقین مجھے
سہم یہ انقلاب یہ تغییر دیکھ کر

وہ ہیں غرور حسن سے ضحاک روزگار
شانوں پہ اپنے زلف گرہ گیر دیکھ کر

سفاک خلق تجھ کو خدا نے بنا دیا
اہل جہاں کو لائق تعزیر دیکھ کر

خالق عطا کرے مجھے دیوانگی عشق
آنکھیں بچھاؤں حلقۂ زنجیر دیکھ کر

جب دل الٹ چکا تو ہوئے ہیں وہ مہرباں
اب کڑھ رہے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

میر اگلا ہے ہاتھ مرا تم کو کیا غرض
بازو سے کیوں لپٹ گئے شمشیر دیکھ کر

اے نظم تجھ کو فلک کے ستم کا گلہ نہیں
کرتے ہیں شکر خواہش تقدیر دیکھ کر

٧٨ ـــــ فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ـــــ ١٧

مجھ کو یا رب تو عطا کر دل نالاں دو چار
دل ہوں دو چار تو ہر دم لب افغاں دو چار

اے جنوں مجھ کو دکھا عالم امکاں دو چار
شش جہت کو میں سمجھتا ہوں بیاباں دو چار

گیسوؤں میں ہے شب وصل کا نقشہ باقی
کچھ گندھی رہ گئیں زلفیں تو پریشاں دو چار

میں ہوں وہ کشتۂ حسرت کہ لحد پر میری
اڑتے پھرتے ہیں حسینوں کے گریباں دو چار

شادی و غم کو یہ مانا کہ ہم ہیں لیکن — سیکڑوں دہر میں گریاں ہیں تو خنداں دو چار
نہ تو ہم تھے نہ کیا کچھ نہ کہا کچھ ہم نے — تہمتیں چند لگا دی گئیں بہتان دو چار
سایۂ سرو میں بیٹھے ہیں کہ آزاد ہیں ہم — کاٹ دینگے اسی کملی میں زمستاں دو چار
رات اندھیری تھی مگر سیکڑوں تارے ٹوٹے — آئے تھے خون کے آنسو سر مژگاں دو چار
ایک دانہ کی گرہ میں ہیں بہت سے خرمن — ایک غنچہ کی بغل میں ہیں گلستاں دو چار
لاکھ صدمے ہوں مگر عشق کا ایسا ہی مزا — کہ ہزاروں میں ہوئے ہونگے پشیماں دو چار
کیا لا مجھکو صبا کھول کے غنچہ کی گرہ — نکلے دو چار جو دامن تو گریباں دو چار
اتنے فرقے ہوے کس طرح مسلمانوں کے — یہ تو معلوم ہے اوترے نہیں قرآں دو چار
اپنے ساحل پہ جگہ دے ہمیں اے بحر کرم — تشنہ لب جھیل کے آئے ہیں بیاباں دو چار
پیکر خاک کجا اور کجا عقل و حواس — اوترے ہیں منزل خاکی میں یہ مہماں دو چار
غم سے کیوں زرد ہے تو دیکھ تماشائے جہاں — رنگ بدلے گی ابھی گردش دوراں دو چار
کوچۂ تنگ میں ہیں سیکڑوں مضمون صفی — میرے خامہ کیلئے چاہئیے میداں دو چار

اِن میں کچھ ہی اشعار ہیں حاصل اے نظم
آسماں بھر میں ستارے ہیں درخشاں دو چار

٧٩ ———— ٢٦

رو دیئے ناصح بے درد کے سمجھانے پر — ہنس دیے راز غم عشق کے کھل جانے پر
ناز کرتا ہے فلک ظلم و ستم ڈھانے پر — اور زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جانے پر

تف ہی ای دور فلک اس تیرے میخانے پر
نہ تو یاروں پہ بھروسہ ہی نہ یارانہ پر
مجھکو جھٹکے نہو ے تاری نہ دکھا ای گردوں
سعی سی باز نہ آب رواں کے مانند
حیف چھاتی پہ سلاطین کے وہ رہتے ہیں
نہ تسلط ہے کسی کا نہ مزاحم کوئی
سلسلہ خواب پریشاں کا ہی بیداری بھی
نہ ملی موج حوادث سی تہمتن کو پناہ
حرص کیوں آئے یہاں تو ہی قناعت یہ گذر
کس طرح میں نہ تری دام میں آ الجھوں
چونکو ہشیار ہوا ے سایہ میں سیمرغ کے الو
سو سخن شہر خموشاں میں لب گور پہ ہیں
سرکشو گور غریباں میں یہ کیا حال ہوا
کچھ نہ اندیشہ عقبیٰ ہی نہ فکر دنیا
اس زمانے میں نجانے تو کہاں تھا وعلا
کاسہ گرنے تو نہ پائی کہیں جمشید کی خاک
جانفشانی میں امیر انداز پر افشانیں

رشک ہی خضر کو سقراط کے پیمانہ پر
دیکھ دھوکا نہ یگانہ کا ہو بیگانہ پہ
طائر عرش ہوں گرتا نہیں میں دانہ پر
نقش تدبیر کا بن بن کے بگڑ جانے پر
خس کی ٹٹی نہ ہوئی قبر کے تہ خانے پر
سو خزانے ہوں تصدق کروں ویرانہ پر
ہوش آیا نہ ہمیں ہوش کے بھی آنے پر
تیغ پہ رکتی ہی جوشن پہ نہ دستانہ پر
کہہ دو تمہی کا ہی بھیجا مری کاشانہ پر
کہ مرا نام تھا لکھا ہوا ہر دانہ پر
اب تو عبرت ہو تمہیں صورت کے بدلجانے پر
ہمکو ہوتی نہیں عبرت کسی افسانے پر
سر اوٹھایا نہ کبھی پاؤں کے ٹھکرانے پر
رشک کس طرح نہ عاقل کو ہو دیوانہ پر
دل کو جب ناز تھا قابو سی نکل جانے پر
نام لکھا ہی تو لکھا ہے پیمانہ پر
رشک ہے والہ کو مجھ پہ مجھے پروانہ پر

بادہ خواری کا مزا ہو کہیں اوقات اب تو
مے گرے گر جلنے پہ ساغر کے چھلک جانے پر

نامۂ شوق کا مطلب تو پڑھ کر دیکھو
رقص کرتا ہے کبوتر مرے افسانے پر

اے نسیم سحری کس سے شگفتہ ہے ملا
چاک ہوتے ہیں گریباں ترے اٹھلانے پر

زرفشاں ہونے کو ناحق نکل آیا خورشید
ابر آمادہ تھا ہن باغ میں برسانے پر

کیا خبر کون ہیں بیہوش یہاں آپ ہیں کون
وہ بھی دیوانے ہیں جو ہنستے ہیں دیوانے پر

ہمہ تن گوش تو ہیں گل مگر اے مرغ چمن
کان رکھتا بھی ہے کوئی ترے افسانے پر

ایک جلوہ کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا ظالم
بیخودی بزم میں چھائی رہی پروانہ پر

۸۰

ہوش پر تیرے ہیں افعی کبھی رخسار و نیر
تاک انگور درختوں پہ چڑھی تھی گل تک
بھیڑ کی تھی لب جاں بخش کا شہرہ سن کر
میں وہ نالاں ہوں کہ ہو بن کی پیدا آواز
رحم مجھ پر تو نہ آیا تجھے مرتے مرتے
یا نہیں گر دشمن مری قتال دے تو دی شراب
تلف عمر پہ زاہد ہے پریشاں کیسا
ہوش سودا میں یہ آتش قدمی تو دیکھو

۲۱

خود ستمگر ہو عنایت ہے ستمگاروں کی
آج تو چاند پڑی باغ کی دیواروں کی
چشم فتاں نے چھری پھیر دی تلواروں کی
ہاتھ دوڑاؤں گریباں کے گرفتاروں کی
مہربانی ہے یہ کیوں پیکر غداروں کی
منہ جو پوچھوں ہی تو ملک ترے رخساروں کی
دیکھا رحمت کو اترنے جو گنہ گاروں کی
کہ میں شعلہ کی طرح دوڑتا ہوں خاروں کی

رکھتے ہیں ابرو و عارض صفت تیغ و ترنج
تو چھری پھر گئی یوسف کے خریداروں پر

ہوس لذت بیداد نہ پوچھو مجھ سے
دل جب آتا ہی تو آتا ہے دل آزاروں پر

تکلف یہ ہی ابھی تشنگی نہیں اسنے تلوار
ٹوٹ پڑتے ہیں گنہ گار گنہگاروں پر

باغ سی قوس قزح کی نظر آتی ہی طناب
خیمہ زن ابر ہوا آکے جو کہساروں پر

ہو گیا مستوں کی جھرمٹ میں جو خورشید غروب
سرخ ہیں رنگ شفق پھولی ہی رخساروں پر

سختیاں عشق کی جس طرح سے جھیلیں گے
ہم نے دیکھی ہی تجلی انہیں کہساروں پر

جز رہ گئی کس کی سواری فلک ششم سی
رشک جبریل کو ہے غاشیہ برداروں پر

عیب سی دیکھا عجمی انگشت شہادت کی طرح
انگلیاں اٹھتی ہیں یوسف کے خریداروں پر

میرے نالی کو جو کوٹھے پہ نہ آنے دو گے
چاندنی نکلے وہ رہ جائیگا دیواروں پر

دل مٹتا ہے یہ شاید کسی دیوانہ کا
آج کوندا نظر آتا ہے جو کہساروں پر

لالہ پھولا تو یہاں آنکھوں میں سرسوں پھولی
بیخودی چھائی گھٹا دیکھ کے کہساروں پر

سختیاں طالب دیدار اٹھاتی ہیں عبث
شکریں کھا چکے موسی انہیں کہساروں پر

نالے سو دہی فریاد ہی بیکار ای نظم
رحم آئیگا نہ ظالم کو گرفتاروں پر

۸۱ —— ۱۶

کروٹوں میں ہی رہا پہلو کی شاخ کیونکر
گندھ گیا ہار کی کلیوں میں مرا دل کیونکر

جذب دل کھینچ تو لے لیلی و سلمی کو ہم
دیکھیں تو آتی ہے محمل سے محمل کیونکر

گورے گالوں پہ ٹھہرتی نہیں نظر شکل سے — ہیں یہ چیلے بیٹھیں کاجل کے بنے تل کیونکر

پا گئی راہِ فنا تو تو تڑپ کر اے برق — دیکھیں ملتا ہے ہمیں جادۂ منزل کیونکر

تجھ سے تو ضعف سے کروٹ نہیں لی جاتی — ہوں یہ حیران تڑپتا ہے مرا دل کیونکر

کسطرح باغ میں بہلے گا دلِ زار اپنا — اور سنی جائیگی فریادِ عنادل کیونکر

ہمتِ پیرِ مغاں کی ہیں کرامات یہ سب — ابھی خالی تھی ابھی بھر گئی محفل کیونکر

تین دن تو رہی ظلمات میں کشتی ہلال — آ گئی ڈوبتی تیرتے لبِ ساحل کیونکر

برق رفتار ہی کیا قافلۂ عمرِ رواں — ایک دم میں یہ گیا سیکڑوں منزل کیونکر

دل کو رکھونگا میں اب باندھ کے زنجیروں میں — دیکھتا ہوں کہ تڑاتا ہے سلاسل کیونکر

موج دریا سے یہ عبرت کا فسانہ سن لو — کشتیاں ڈوب گئی ہیں لبِ ساحل کیونکر

کچھ غبارِ سرِ رہ کو یہ خبر ہے معلوم — قافلے لٹ گئے آ کر سرِ منزل کیونکر

کچھ خبر شمعِ فروزاں کو ہے پروانہ کی — ایک جلوہ میں یہ سب ہو گئے بسمل کیونکر

دلِ پُر درد تو شیشہ سے سوا ہے نازک — اب کہو صبر کی چھاتی پہ دھروں سل کیونکر

میں ہوں بیمارِ غم اور عمر کی منزل ہے پہاڑ — ناتوانی میں کروں قطع مراحل کیونکر

دورِ گردوں میں ہے بےقدریِ اربابِ کمال — جائے حیرت ہے کہ چمکا مہِ کامل کیونکر

۸۴ — ۱۴

دھوکا زلفوں نے دیا عنبرِ سارا بن کر — سحر آنکھوں نے کیا نرگسِ شہلا بن کر

مرضِ عشق میں سو مرتبہ میں مر کے جیا — پوچھ لو ان سے جو بیٹھے ہیں مسیحا بنکر

ہوگئی زلفِ پریشاں تو کمر سے اسکی
حلقۂ زلف لپٹنے لگے چھلّا بن کر

دن بھی نکلا تو بلائے شبِ فرقت منہ ٹلی
پیچھے پیچھے دوڑا مری سایۂ شبِ یلدا بن کر

پی لیا تھا جو مرا خون تری ناوک نے
منہ سے سوفار کے نکلا وہ کلیجا بن کر

اسقدر خاک میں پنہاں ہیں تباں مہوش
گردباد اوٹھی تو رہ جائے کلیسا بن کر

ہر طرح کی حرکت نام کو ہم رکھتی ہیں
اوٹھتے ہیں نہ بیٹھتے ہیں نقشِ کفِ پا بن کر

اب مجھے صبحِ قیامت کی بھی امید نہیں
کہ فلک سر پہ گرا ہی شبِ یلدا بن کر

لاکھوں ہی شیشۂ دل روزِ ازل چور ہوئی
تب یہ تیار ہوا گنبدِ مینا بن کر

سبحۂ حضرتِ واعظ پہ نہ تھا مجھکو گمان
کہ گلا گھونٹ ہی ڈالے گا یہ پھندا بن کر

میری تصویر کھچی گر تری تصویر کے ساتھ
دیکھ لینا کہ بگڑ جائیگا نقشہ بن کر

باغ تو خوب ہی حسرت نے لگایا ہی مگر
مٹ نہ جائے کہیں دیکھو یہ گھروندا بن کر

خاکساروں کا تری شوق میں اٹھا تھا غبار
رہ گیا ہے یہ وہی عرشِ معلی بن کر

کیا ہوا ای نظم بیاں صبر و قناعت کا مزہ
نعمتیں مجھ پہ یہ اتریں منّ و سلویٰ بن کر

۸۳ —————— ۱۲

دُرِ دنداں پہ چھپے صاعقہ افگن ہو کر
یا کنول بجھ گئی الماس کے روشن ہو کر

بھیس بدلے ہوئے رہتی ہی قضا عاشق کی
عشوہ ہو کر کبھی مارا کبھی چتون ہو کر

کیا سیاہی شبِ ہجراں نے ہے کیا تاریکی
رہ گیا شمع کا شعلہ گلِ سوسن ہو کر

وہ نہیں ہیں تو زمانہ ہے نظر میں اندھیر
شمع منہ اپنا ہی دیکھا کرے روشن ہو کر

وصل سمجھوں کہ اسی ہجر میں اے بندہ نواز
دور رہتے ہو قریب رگ گردن ہو کر

ہے غرور اہل جہاں سے کہ ملا ہے ہم کو
جادۂ منزل عرفاں رگ گردن ہو کر

نگہ ناز نے تاراج کیا خانۂ دل
چور بنکر کبھی لوٹا کبھی رہزن ہو کر

نامرادی کا میں خوگر تھا بر آئی جو مراد
شکر منہ سے مرے نکلا بھی تو شیون ہو کر

گردشیں چرخ کی سر پر نہ ہوں جب مجھ سے
آگے قدموں پہ گریں حلقۂ آہن ہو کر

ماہ نو دیکھ کے اوس ترک کماں ابرو کو
مل گیا خاک میں نقش سم توسن ہو کر

سخت مشکل ہے جنوں اوٹھی دیکھ کے حالت میری
نالے کرنے لگی زنجیر بھی آہن ہو کر

لکھنؤ گردش گردوں نے چھڑایا اے نظم
دور پھینکا مجھے آخر کو فلاخن ہو کر

۴۸ ۱۶

سرو قد حشر اٹھا قامت [illegible]
قتنے بیدار ہوئے نرگس جادو ہو کر

شام ہی سے یہ شب عیش کا عالم دیکھا
تا کمر آ گئی طول شب گیسو ہو کر

صبح ہو اے شب عشرت تری صدقے جاؤں
ڈھانک لے چہرۂ خورشید کو گیسو ہو کر

سنتیں مان رہا ہے مرد مردمک فلک
سر پہ آئی جو بلا رہ گئی گیسو ہو کر

لب پہ ہے مہر خموشی کی مگر آنکھوں سے
حسرت دید ٹپک پڑتی ہے آنسو ہو کر

حسرتیں دل کی نہ نکلیں مرے [illegible]
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہو کر

یک بیک چھٹک دیا نہ سہا جو آئے شب وصل
شعلۂ شمع اڑا جاتا ہے جگنو ہو کر

دل نے ویرانہ سے لگایا کہ ہیں آزادہ روش
چمنستاں میں نہیں بھی تو بسی بو ہو کر

لے گیا عہد جوانی نہ ہمیں ساتھ افسوس
ڈھونڈتے رہ گئے گرد رم آہو ہو کر

راہ میں خشک زراعت تھی نہ دیکھی ابر نے
کیا برستا ہوا جاتا ہے لب جو ہو کر

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑی پر تو آئینہ زانو ہو کر

بے سبب قتل کیا پھیر کے چتون اس نے
چل گئی دل پہ چھری جنبش ابرو ہو کر

آئینہ اس کو دکھانے جو لگا جوش شکر
رہ گیا سکتے میں وہ سرو لب جو ہو کر

دل اگر ایک طرف ہے تو جگر ایک طرف
تولتی ہے نگہ ناز ترازو ہو کر

مجلس غیر میں مہماں سے نہ اٹھیں گے ہرگز
پاؤں اب توڑ کے بیٹھے ہیں دو زانو ہو کر

قدر اے نظم کسی نے بھی نہ جانی ہرگز
دامن دشت میں مہکا گل خود رو ہو کر

۸۵ —— فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات —— ۱۲

آستیں تو چڑھائی ہے مری تقریر پر
کچھ بتاؤ تو سہی آخر یہ کس تقصیر پر

پانی اس صحرا میں نایاب رہے زخمی کو پیاس
ایک قطرہ آب اگر دیکھا تو نوک تیر پر

آن ہے جن کی طبیعت میں عجب مشکل پسند
ہر قدم اس کارواں کا ہے دم شمشیر پر

سعی لا حاصل سہی میں باز آنے کا نہیں
ہنسنے دو تقدیر ہنستی ہے اگر تدبیر پر

صبر کی تلخی میں بھی لذت ہے وہ واقف آتش
مکھیوں کی طرح جو گرتے ہیں شہد و شیر پر

دل میں تھا صبا کے خود حسد ہو جانیکا خوف
ٹوپیاں وسنی چڑھادیں دیدۂ نخچیر پر

پہلے تو وہ گذرا جو کچھ ہے عزم بلند
بعد اسکی کر بھروسا خواہش تقدیر پر

اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا
ہے بھروسا ہم کو برق نالۂ شبگیر پر

خوف رسوائی سے اٹھتی ہے صدا جھنکار کی
گر کسی کی آنکھ پڑتی ہے مری زنجیر پر

خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے
کیا دوا ہر درد کی موقوف ہے اکسیر پر

کہنے سننے کا اثر اغیار پر ہوتا نہیں
آرہا اہل وفا کا فیصلہ شمشیر پر

جانتا ہوں میں کجا خاک در جاناں کجا
نظم مجھ کو ناز ہے اس خوبی تقدیر پر

۸۶ مفاعلن فاعلن فعولن دوبار ۱۸

ہنسی میں وہ بات میں نے کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہوکر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرہ کا رنگ ہوکر

ہمیشہ کوچ و مقام اپنا رہا ہے خضر رہ طریقت
رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آوازہ زنگ ہوکر

نہ توڑتے ارسی اگر تم تو اتنے یوسف نظر نہ آتے
یہ قافلہ کھینچ لائی سارا شکست آئینہ زنگ ہوکر

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پردہ رہی فسانہ
یہ رہگئی بن کے گرد حسرت وہ اڑگیا رخ سے رنگ ہوکر

جو راز دل سے زباں تک آیا تو اس کو قابو میں پھر نہ پایا
زباں سے نکلا کلام بنکر کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر

غضب ہے بحر فنا کا دھارا کہ مجھکو الجھا کے مارا مارا
نفس نے موجوں کا جال بنکر لحد نے کام نہنگ ہو کر

ملا دل نا حفاظ مجھکو تو کیا کسی کا لحاظ مجھکو
کہیں گریباں نہ پھاڑ ڈالیں جناب ناصح بھی تنگ ہو کر

جواب کی مینائے مے کو توڑا اجل کی تلوار محتسب سے
لہو بھی رندوں کا دیکھ پینا بہا مے لالہ رنگ ہو کر

نہ ضبط سے شکوہ لب تک آیا نہ صبر کو آہ کھینچنے دی
رہا دہن میں وہ قفل بنکر گرا یہ چھاتی پہ سنگ ہو کر

سمجھ لے صوفی اگر یہ نکتہ ہے ایک بزم سماع ہستی
تو نو پیالے یہ آسماں کے بجیں ابھی جل ترنگ ہو کر

بھلا ہوا افسردہ خاطری کا کہ حسرتوں کو دبا کے رکھا
بچا لیا ہرزگی سے اس نے لحاظ ناموس و ننگ ہو کر

جگر خراشی سے پائی فرصت نہ سینہ کاوی سے ناخنوں نے
گلا گریباں نے گھونٹ ڈالا جنوں کی شورش سے تنگ ہو کر

بدل کے دنیا نے بھیس صدہا اسے ڈرایا اُسے لبھایا

کبھی زن پیرزال بنکر کبھی بت شوخ و شنگ ہو کر
اٹھی تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی میری دل کی حسرت شہید تیغ درنگ ہو کر
جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجوم یاس قلق میں حیدر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ و دنگ ہو کر

۱۳ مفاعیلن ۴ بار ۸۷

جنوں کے ولولے جب گھٹ گئے دل میں نہاں ہو کر
تو اٹھے میں ہوا ہو کر گرے میں بجلیاں ہو کر
کچھ آگے بڑھ چلی سامان راحت لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گرد کارواں ہو کر
کسی دن تو چلے اے آسماں باد مراد ایسی
کہ اتریں کشتی مے پر گھٹائیں بادباں ہو کر
نہ جانے کس بیاباں مرگ نے مٹی نہیں پائی
بگولے جا رہے ہیں کارواں در کارواں ہو کر
وفور ضبط سے بیتابی دل بڑھ نہیں سکتی
گلے تک آ کے رہ جاتے ہیں نالے ہچکیاں ہو کر
گلو گیر اب تو ایسا انقلاب رنگ عالم ہے

کہ نغمے نکلے منقارِ عنادل سے فغاں ہو کر
جو ہو کر ابر سے مایوس[1] خود سینچی کبھی دہقاں
جلا دیں کھیت کو پانی کی لہریں بجلیاں ہو کر
جہاں میں واشدِ خاطر کے ساماں ہو گئے الٹے
جگہ راحت کی ناممکن ہوئی ہے لامکاں ہو کر
ہنسے کوئی نہ بجلی کے سوا اس عالمِ ماتم میں
اگر یہ جائے سارا کھیت کشتِ زعفراں ہو کر
الم میں آشیاں کے اس قدر تنکے چنے ہیں تو
کہ آخر باعثِ تسکیں ہوئے ہیں آشیاں ہو کر
گھٹائیں گھر کے کیا کیا حسرتِ فرہاد پر روئیں
چمن تک آ گئیں نہریں پہاڑوں سے رواں ہو کر
دلِ شیدا نے پایا عشق میں معراج کا رتبہ
یہاں اکثر بتوں کے ظلم ٹوٹے آسماں ہو کر
لبو ڈرتے ڈرتے دل سے ایک حرفِ شوق نکلا تھا

[1] مایوس فارسی والوں کا تراشا ہوا لفظ ہے اور لغات فرس میں بغلط عام ہی فصیح ہے اور اب اردو میں بھی مستعمل ہو گیا ہے۔ اسے فارسی میں نہیں استعمال کرنا چاہیے منوس بھی مایوس کے قیاس پر فارسی والوں کا تراشا ہوا ہے ۱۲

وہ اس کے سامنے آیا زباں بر داستاں ہوکر

نکل آتے ہیں پہ اقرار میں انکار کے پہلو
بنا دیتی ہیں حیراں تیری باتیں مکر یاں ہوکر

نزاکت کا یہ عالم پھول بھی توڑے تو بل کھا کر
نہ جانے دل میرا کس طرح توڑا پہلواں ہوکر

اندرو و کیک پر ہنس کر اٹھی خود لڑکھڑاتے ہیں
سبک کرتے ہیں ان کو پانچے بار گراں ہوکر

گلا گھونٹا ہی ضبط غم نے کچھ ایسا کہ مشکل ہے
کہ نکلے منہ سے آوازِ شکستِ دل فغاں ہوکر

نتیجہ اندیشۂ سالک نے پایا منزلِ دل کا
تو پلٹا لامکاں سے آسماں در آسماں ہوکر

ہوئی پھر دیکھیے آ بسنن شادی و غم دنیا
ابھی پیدا ہوئے تھے رنج و راحت تواماں ہوکر

جو نکلی ہوگی کوئی آرزو تو یہ بھی نکلے گا
تمہارا تیر حسرت بن گیا دل میں نہاں ہوکر

اوتر جائیگا تو او آفتاب حسن کوٹھے سے
گریگا سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

۸۸ ولہ ۷

وہی سمجھیں گے اس کو جو نظر رکھتے ہیں جوہر پر
کہ اب تک ہنس رہا ہے آئینہ بختِ سکندر پر
خبر دیتا ہے بیتابی کی اشکِ خوں سرِ مژگاں
لہو کی بوند دیکھو اور کروٹ نوکِ نشتر پر
مے عرفاں کہ جھوٹی کی ہوئی ہے میرے ساقی کی
ٹپکتی ہے مری رال اُس شرابِ روح پرور پر
بنائی جان ایسی سخت اور دل اسقدر نازک
زہے قدرت تری پھینکا ہے کیا شیشہ کو پتھر پر
بڑھایا کیا سمجھ کر اور اس پر بارِ عصیاں بھی
ازل کے دن سے کچھ بارِ امانت کم نہ تھا سر پر
کہیں ایسا نہو نالوں سے میرے حشر ہو جائے
مرا انصاف یارب تو نے کیوں رکھا ہے محشر پر
لہو اشک آنکھوں میں بھر لائی ہو آئینہ دکھادوں میں
ڈھلکنا دیکھ لو شبنم کا رخسارِ گلِ تر پر

۸۹ فاعلاتن مفاعلن فعلات ۸

آفریں شوق گام فرسا پر | گر کے اٹھا ہوں ہیں ہر اک جا پر

باندھی ہے مدح شہ کی وصن میں نے
نغمۂ عندلیب شیدا پر

دے خدا اگر دل و زباں تو کرے
شکر راحت پہ صبر ایذا پر

جزر و مد میں فنا کے ہے عالم
یہ رہا ہے یہ قصر دریا پر

ق

آسماں پھینکتا ہے سنگ جفا
تاک کر قلب ناشکیبا پر

رقص اس گنبد زبرجد کا
ہے صدائے شکست مینا پر

کچھ سلیماں سے بھی زیادہ ہے
ناز منعم کو نقش دیبا پر

خطبہ پڑھتا ہے پیرزن کا غبار
عدل کسریٰ کا طاق کسریٰ پر

حرف ش

۹۰ —— ۱۴

خار حسرت کو ہے جگر کی تلاش
گل داغ جنوں کو سر کی تلاش

عشق میں تیرے ہے جہاں بیمار
چارہ گر کو ہے چارہ گر کی تلاش

اپنے دل میں خدا کو ڈھونڈھ لیا
حد سے اب بڑھ گئی بشر کی تلاش

میں دعا مانگتا ہوں محشر کی
ہے جو اک شوخ فتنہ گر کی تلاش

میکدہ کو ہمارے ڈھونڈھ لیا
گئی خالی نہ ابر تر کی تلاش

سرمہ خوش چشم کو ہے مد نظر
فتنہ گر کو ہے فتنہ گر کی تلاش

جو رہ عشق میں ہیں وارفتہ
نہیں رکھتے وہ راہبر کی تلاش

ایڑیوں تک پہنچ کے ٹھہری زلف
مصرعِ قد ہے رات بھر کی تلاش

دوپہر تک تھا انتظار اوس کا
دوپہر تک رہی سحر کی تلاش

مجھ کو سکتا ہوا جو ہجر کی شب
رہی آئینہ سحر کی تلاش

غرق رہتا ہوں فکرِ مضموں میں
ڈوب کر چاہیے گہر کی تلاش

یا الٰہی ہو ایسا جوشِ بہار
رگِ گل کو ہو نیشتر کی تلاش

دل جو ٹوٹا تو پھر نہیں جڑتا
کیجیے خاک شیشہ گر کی تلاش

مل گئی قبر کی جگہ اے نظم
ہو گئی ختم عمر بھر کی تلاش

۱۹ ——— مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہ ——— ۱۰

شب قدر است زلف عنبرینش
طلوع صبح عید است از جبینش

شہ با دل کہ حق یار و نگہبان
بہ تاج و تخت و ملک و داد و دینش

چناں آراست ملکش در زمانش
کہ مثل آسماں شد سرزمینش

معظم جاہ شد ماہ تمامش
چو اعظم جاہ شد مہر مبینش

رواں کردست دریا در بیاباں
کہ باشد بحر عمّان در کمینش

فلک نیلی ز عکس آبگونش
زمیں سرسبز از ماء معینش

زہے ایں چشمہ سار صاف شیریں
عیاں راز دل از چین جبینش

چناں کشت دکن را کرد شاداب
کہ عذر ابر فلک شد خوشہ چینش

کنارِ رودِ موسی داور یگاہ
زہے شاہیکہ در قالب بُد روح
۹۲

کہ موسی خاتم است و او نگینش
صریر کلک معنی آفرینش
۱۳

ولہ

طلسمے بیش نبود لجۂ ہستی و سیلابش
کہ برہم میزند موج فنا صد نقش بر آبش
زند صد قافلہ پے ہم کند صد سلسلہ برہم
گہ از ابروئے پُرچینش گہ از گیسوی پرتابش
دوائے دردِ دل باشد لب آں عیسی دوراں
کہ دارد طعم صد تنگ شکر اندر دو عنابش
چو اکسیرِ وفا خواہی شرار عشق روشن کن
دل مضطر بدست آور کہ بیتابیست سیمابش
رگِ نخوت ہمی باشد طناب گردن ظالم
کہ بر خاک مذلت میکشد از فرش سنجابش
بہ زخمِ ابروے او لذت آزارده چنداست
کہ بوئے مشک می آید ازیں تیغ سیہ تابش
اگر سر می نہم بر پائے نازک سرگراں گردد
دگر سر می کنم افسانہ غم می برد خوابش

سپہر و انقلاب پے ہم او نیست بے چیزے
کہ خون عالمے چوں آب خواہد ریخت دولابش

بگورستاں سر فغفور می بینم سر خشتے
کجا شد بالش خاقاں کہ بد نازش گہ خوابش

اگر برخاست روزے گرد باد از آہ مظلوماں
شکست اوتاد ایں نہ خرگہ نیلی و اسبابش

دریں جوش سرشک از ماجرائے دل چہ می پرسی
کہ سر برزد حباب آسا بحر و بر و سیلابش

عزیزے کو کہ از اسرار ہستی پردہ برگیرد
دل خلقے بجاں آمد ز یک تعبیر و صد خوابش

نباشد صورتے فارغ ز معنی اندریں عالم
چو آئینہ قدم زن در رہ دیدار بیتابش

حرف ض

۹۳ ——— ۱۰

چھیڑ ابرے اوڑتی ہوئی دی بہنے کا
کانٹوں پہ ہی دوڑ کے اگلوا تی ہے رشتہ
آتا نہیں دریا کی روانی میں کبھی فرق

ساقی نظر فیض ہو ساقی نظرے فیض
اک وادی اسرار ہے اک رہ گذر فیض
تھمتے نہیں تھمتے نہیں شوریدہ سر فیض

کہتے ہیں جسے چشم طلب وہ تو ہو پیدا
اک جنبش مژگاں سے کہیں لاکھ در فیض

طوبیٰ لکم اے اہل کرم واہ ری رفعت
لے اڑتے ہیں طوبے کی طرف بال و پر فیض

اے پیر مغاں دست عزیز تیرے ہیں بخشش
ہاتھوں کی لکیریں ہیں کہ ہیں رہگذر فیض

کیا اہل قناعت کو غرض اہل غنی سے
ہم کو نہ غرض اب نہ ادھر ہیں نہ در فیض

زاہد تجھے کیا اس کی کریمی سے عجب ہے
توبہ کا ہو در بند تو کھل جائے در فیض

گرداب حوادث میں ہوں اے سید فیاض
اتر جاؤں میں ہو جائے جو مجھ پر نظر فیض

مانند نگیں آنکھ جھپک جائیگی اے نظم
اٹھ جائیں گے ہم چھوڑ کے اپنا اثر فیض

۹۴ ——— حرف (ف) ——— ۱۶

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف
چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے بدن کی طرف

بنایا تونے آئینہ آہ سینہ نما نہ
نہ دیکھی راہ جو خلوت سے انجمن کی طرف

رہ وفا کو نہ چھوڑا وہ عندلیب ہوں میں
چھٹا قفس سے تو پرواز کی چمن کی طرف

گریز چاہیے طول امل سے سالک کو
سنا ہے راہ یہ جاتی ہے راہزن کی طرف

سفر کرو ہو کہیں ہو گے تا قلہ کت تک
اٹھو تو کیا تمہیں جانا نہیں وطن کی طرف

بیاں دل میں اگر ہے یہ داد اہل نظر
نہیں ہے شیخ کی جانب نہ برہمن کی طرف

لہ آئینہ کے ہر ٹکڑے میں پورا عکس دکھائی دیتا ہے مگر ہر ٹکڑا آئینہ بن جاتا ہے ۱۲

جہانِ حادثہ آگیں میں لشکر و رود
گذر حباب کا دریا ہے موجزن کیطرف

اسی امید پہ ہم دن خزاں کے کاٹتے ہیں
کبھی تو باد بہار آئیگی چمن کیطرف

بچھڑ کے تجھ سے مجھے ہے امید ملنے کی
سنا ہے روح کو آنا ہے پھر بدن کیطرف

گواہ کون ہے قتل کا ہو محشر میں
ابھی سے سارا زمانہ ہے تیغ زن کیطرف

جہیر دیکھ کے دیانت اسکو آنے کی
خدا ہی خیر کرے رخ ہے انجمن کیطرف

وہ اپنے رخ کی صباحت کو آپ دیکھتے ہیں
جھکے ہوئے گل نرگس ہیں یاسمن کیطرف

تمام بزم ہی کیا ہو اوس کی بات تو نہیں
نظر دہن کیطرف کان ہے سخن کیطرف

اسیر ہو گیا دل گیسوؤں میں خوب ہوا
چلا تھا ڈوب کے مرنے چہ ذقن کیطرف

پہ ستبیوں کی ادا اثر بھی سکے گئے
لگا رہے جو سے جو اٹھے چلے چمن کیطرف

زہے نصیب جو ہو کربلا کی موت نظم
کہ اوڑھ کے خاک شفا آئے خود کفن کیطرف

۹۵ —— (۸۱)

ہوں میں بید ہو گیا وحشت میں بیاباں کیطرف
ہاتھ جس طرح سے آتا ہے گریباں کیطرف

تنہے مبیٹھے دل آگئیں کو یہ کیا آہ ری
اوٹھ کے طوفان چلا دیدۂ گریاں کیطرف

دیکھنا لالۂ خود رو کا لہکنا ساقی
کوہ سے دوڑ گئی آگ بیاباں کیطرف

رو دیا دیکھ کے اکثر میں بہار شبنم
ہنس دیا دیکھ کے اکثر گل خنداں کیطرف

بات چھپتی نہیں بیٹھی ہیں نگاہیں سب کی
اوس کے دامن کی طرف ہے ... یا ... کیطرف

سیکڑوں داغ گنہ دھو گئے رحمت تری
کیا گھٹا جھوم کے آئی تھی گلستاں کی طرف

چشم آئینہ پریشاں نظری سیکھ گئی
دیکھتا تھا یہ بت زلف پریشاں کی طرف

سر جھکائے ہوئے ہے نظم بیان خامہ
سمت سجدے کی ہے تیری خط فرماں کی طرف

۹۶ — حرف ق — ۱۲

خاک جاں پر ہو مبتلائے فراق
لے چلی قبر میں بلائے فراق

ہے فلاطونِ عشق کا ارشاد
شربتِ مرگ ہے دوائے فراق

منہ بنا ہے طرزِ نازشِ وصل
منہ پھرا ہے اک ادائے فراق

شب فرقت ابھی سحر ہو گی
لب تک آئیں تو نالہائے فراق

تھے مزے عشق کے جوانی تک
ہائے لطف وصال ہائے فراق

وصلِ یار کی تو دعا قبول نہیں
مانگنا چاہیے دعائے فراق

ہو گئی صبح رہ گیا قصہ
تھے ابھی لب پہ شکوہ ہائے فراق

تا فلک پہنچی تا اثر نہ گئی
واہ ری آہ نارسائے فراق

چشم پر خوں کا جام پر ہے یقیں
گریہ سمجھا میں خندہ ہائے فراق

آشنا تب اضطراب کا ہے
دل کو حاصل ہے کیمیائے فراق

ساغرِ بادہ سے ہے دل پر خوں
شور فریاد سے ہے صلائے فراق

جی بچا گر تو وصل یار سے پھر
جمیل نے نظم سب جفائے فراق

حرف م

۹۷ —— —— ۱۷

نہ پا سکے گل مقصود اس بہار سے ہم
ادھر بھی بادیہ کے تجلی خورشید
اثر سے روزی کے ہے وہ ہمارے حسن اسیر
فنا ہوں یوں کہ ملے بعد اس کے عمر ابد
رہیں گے صورت عیسیٰ نہ راہ ہستی میں
کمند بام حقیقت تھا عشق قامت یار
خدا کے واسطے جا یار سے کہے نہ کوئی
نشان کسی کو ہو معلوم عمر رفتہ کا
مٹی نہ کاہش جان بیچ میں رہتے ہیں
[illegible]
[illegible]
نہ خواب میں [illegible]

اٹھا کے داغ چلے باغ روزگار سے ہم
جھلک نہ دیکھ سکے پردہ غبار سے ہم
شکار ہوتے ہیں دام آبشار سے ہم
نکالیں آب بقا ظلمت مزار سے ہم
پیادہ ہوتے اگر نکل جائینگے سوار سے ہم
فلک پہ چڑھ گئے عیسیٰ کی طرح دار سے ہم
اٹھا رہے ہیں جو اپنے اختیار سے ہم
[illegible] غبار سے ہم
خزاں سے [illegible] بہار سے ہم
[illegible]
[illegible]
[illegible]

عدم سے دہر میں برزخ سے آئے محشر میں
رکا نہ پاؤں نہ بیٹھے کہیں قرار سے ہم

خبر یہ صور میں تھی ہو کریم کا دربار
یہ شور سن کے نکل آئے ہیں مزار سے ہم

قطعہ

نہ سمجھے یہ کہ نمائش سراب کی ہے جہاں
غضب میں پڑ گئے ہستی کے اعتبار سے ہم

غضب کا رقص فلک نے ہمیں دیا ہو گا
رہے نہ آپ میں اک جلوۂ شرار سے ہم

ہزار معرکۂ امتحاں ہوئے اے نظمؔ
کسی سے کم نہ رہے فضلِ کردگار سے ہم

۹۸ ——— ۱۲

جاں در ہوائے بادۂ اطہر فروختیم
دل در بہائے ساغرِ کوثر فروختیم

در کارِ سالکاں زر و زیور فروختیم
وز بہرِ حفظِ نام و نسب سر فروختیم

تا مل بہ آں دو زلفِ معنبر فروختیم
خود را فروختیم و مکرر فروختیم

جاں را برائے آبروئے خود فشاندہ ایم
سر را پئے گرفتنِ افسر فروختیم

درماندہ ایم زیرِ فلک چوں ہلال و بدر
تا تیغ آوریم بکف سر فروختیم

تا جا گرفت در دلِ ما خوفِ بازپرس
از رنگِ روئے خود ورقِ زر فروختیم

تر کرد جز اشکِ ندامت بہانہ داشت
آئینہ را بہ آبِ گہرِ تر فروختیم

در شعر بس بخونِ جگر پا فشردہ ایم
[illegible] تر فروختیم

رفتی غبارِ طبع بہ شیریں تبسمی
[illegible] شکر فروختیم

افتاد تا معامله با رحمت خدا | نامه سیاه به محشر فروختیم
روداد خانه مستی ما یکشان مپرس | دستار را به شیشه و ساغر فروختیم
وارفتگی ما بخرام کسی مپرس | خود را بدست فتنهٔ محشر فروختیم

وله

۹۹ —— مفتعلن فاعلات مفتعلن فا —— ۱۱

همتی از باد صبحگاه گرفتم | رفتم و از غنچه رسم آه گرفتم
عزم شبی خون ترا مبارک و فرخ | فال ز بشکستن کلاه گرفتم
دل بغم تو نداشت تاب صبوری | اشک سراسیمه را گواه گرفتم
منفعلم از وفا بعهد محشر | دامن یوسف باشتباه گرفتم
مستی من از شراب گردش چشمیست | باده به پیمانهٔ نگاه گرفتم
خار غمم از بسکه داشت تشنه لبیها | خون دل از نبض برگ کاه گرفتم
باطن من شد ز شرم ظاهر من آب | نکته چو پر آب زیر کاه گرفتم
از قدمم گرد باد تا رگ ابر است | من ز بیابان سراغ جاه گرفتم
خاک بچشم فشاند و قافله بگذشت | سرمه عبرت ز گرد راه گرفتم
نقش ستمگار را بکشم و آنگه | دست و گریبان عذر خواه گرفتم

شعر اسیر است نظم شیخ رضا ما
آتش از آن گرمی نگاه گرفتم

حرف ن

۱۰۰ — مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن — ۲۰

مزہ بیاں میں نہیں اب اثر فغاں میں نہیں
بہار میں جو طبیعت تھی وہ خزاں میں نہیں

جو چل بسے ہیں انکا پتہ جہاں میں نہیں
نشان نقش قدم جا کے رفتگاں میں نہیں

خوشی خوشی شب عشرت کسی میں کٹتا ہوں
کہ ایسی رات کوئی عمر جاوداں میں نہیں

یہ دیکھنا گل و بلبل کی کیا بن آئی ہے
اب اتفاق جو صیاد و باغباں میں نہیں

سمجھ کے یہ جو صبا نکلیں گے آج قاتل کے
مرے سوا کوئی میدان امتحاں میں نہیں

چلی نہ چشم فسوں گر سے کچھ فسوں سازی
وہ سحر کونسا ہے جو مری بیاں میں نہیں

وہ سو کے اٹھے ہیں کسکو مجال عرض نیاز
غزل پہ پوچھیے یہ جرات [illegible] میں نہیں

پھنسا کے ڈال دی ہے میرے دل میں انکی چاہ
مجھے عجب ہے کہ چھالا تری زباں میں نہیں

وہاں خمار تغافل سے سرگرانی ہے
یہاں شراب اثر شیشۂ فغاں میں نہیں

دیا مجھے تری بے رنگیوں نے اک غم عشق
وہ داغ جو پہ طاؤس آسماں میں نہیں

والہوس غم نے بیا تو حسین آیا
کہ آج صورت [illegible] کہکشاں میں نہیں

کشش جو دل میں ہے میری نظر جو اہ [illegible]
[illegible] کہکشاں میں نہیں

فلک شناس ہے اس کے طرز دامن پہ
ستارہ [illegible] یہ [illegible] کہکشاں میں نہیں

جگر میں عشق کا ہے داغ رخ پہ اسکی چمک
فروغ ماہ نہاں پردہ کتاں میں نہیں

وہ کاش سائل دیدار کو جلا دیتا
کوئی شرار ترے سنگ آستاں میں نہیں

ہے ایک قافلہ ریگ رواں عمر رواں
متاع درد محبت جو کارواں میں نہیں

رہی کی کشتی تن غرق ہو کے خشکی میں
جو خاک لائیں کشش ہو وہ بادباں میں نہیں

بزور ہمت مردانہ توڑ ہفت حصار
کہ راہ بندی رستم جو ہفت خواں میں نہیں

جو طبع رمز شناس و کنایہ فہم نہو
تو کچھ مزہ گل و بلبل کی داستاں میں نہیں

برا نہ مان [illegible] کی سے رنج نہ ظلم
کہ ہوشیار کوئی دور آسماں میں نہیں

۱۰۱ —— ۱۵

حریف تم نہ سہی دوستدار بھی تو نہیں
وہ آنکھ اب نہیں وہ چاہ وہ پیار بھی تو نہیں

مرا لہو ہے زاہد جو پی نہ لے یہ جام
کہ دن ہے عید کا نوروز یار بھی تو نہیں

چمکسنج ہے کچھ ایسی کہ ابر و برق ہے مات
ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار بھی تو نہیں

نہیں ہیں ہستی ناپائدار کا قائل
کہ مستعار کہوں مستعار بھی تو نہیں

اٹھاؤں ظلم میں کس کس کا نو فلک میں عدو
کہ دل تو ایک ہے دو تین چار بھی تو نہیں

ہے ایک تار مرے جسم زار کو کافی
مگر کفن کے لئے ایک تار بھی تو نہیں

لحد کا پائیں گے کس طرح سے پتہ لگتا
جنوں میں ایک جگہ پہ قرار بھی تو نہیں

دل و جگر گئے تیغ نگاہ سے چورنگ
پھر اس پہ لطف یہ ہے آنکھ چار بھی تو نہیں

نہ دل لگا کے کبھی درد دل سنا میرا
ہزار بار کہا ایک بار بھی تو نہیں

یہ ہاتھ دوڑ رہا ہے عبث گریباں پر
کہ تار تار ہے یہ کچھ ستار بھی تو نہیں

کریم حشر میں مجھ سے حساب کیا ہوگا
کہ بے حساب گنہ میں شمار بھی تو نہیں

کہا کہ درد جگر پھر کہو میں کہتا ہوں
ستم یہ ہے کہ تمہیں اعتبار بھی تو نہیں

کسی گڑھے میں گرا دے نہ تجھ کو توسن عمر
وہ تیز گام ہے تو شہسوار بھی تو نہیں

اڑانے آتے ہیں ہم خاک کو [illegible]
[illegible] بھی تو نہیں

[illegible] نظم سے [illegible]
جہاں میں ایسا کوئی پردہ دار بھی تو نہیں

۱۰۲ ---------- ۲۵

تو ایک آہ میں اے چرخ کچھ [illegible] نہیں
جو خاک میں ملا دوں تو خاکسار نہیں

کسی سے ہو سکے امید گشود کار نہیں
مجھے [illegible] کا اعتبار نہیں

مجھ کو جو اہل تجھ سے خاکسار نہیں
فلک سے دب کے رہی جو وہ غبار نہیں

فقیر خانہ میں اہل ہوس کو بار نہیں
کہ شمع بھی مری محفل میں تاجدار نہیں

پھر اور کیا ہے یہ عالم جو رہگزار نہیں
کہ ہستی گذراں کا کچھ اعتبار نہیں

ہستی کے گذران ہونے سے معلوم ہوا ہے کہ عالم رہگذار ہے

[illegible] طبیعت میں [illegible] نقصان کیا
[illegible] استوار نہیں

سنبھالے کون [illegible]
[illegible] کوئی بھی ہوشیار نہیں

مجھے [illegible] نقش [illegible] کہتا ہے
[illegible] اعتبار نہیں

کسی کے خون کا پیاسا ضرور ہے عیار
کماں میں تیر ہے قزاق میں شکار نہیں

جواب نامہ کا قاصد عذار پر [illegible]
کہا تھا تمہارے سے تاب انتظار نہیں

یہ کہکے اٹھ گئی بالیں سے میری تیغ [illegible]
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

زمین سخت فلک دور [illegible]
مزہ ہے جان کبھی دینے پہ اختیار نہیں

قریب تر رگ گردن سے [illegible]
نظر کے سامنے وہ پھر بھی آ سکا نہیں

کسی کے جلوہ کو اس مشت خس سے کیا نسبت
وہ صاعقہ نہیں شعلہ نہیں شرار نہیں

جو وہ ہو پاس تو حور و قصور ہیں کچھ ہو
جو وہ نہیں تو نہیں بلکہ یہ بہار نہیں

چھپے جو خال [illegible] کلی [illegible]
چراغ لیکے بھی ڈھونڈو تو پھر مزار نہیں

[illegible]
[illegible] قریب یہاں نخل سایہ دار نہیں

گذر رہے ہیں [illegible] مثل نسیم
کسی کو خار نہیں میں کسی پہ بار نہیں

عدم کا قافلہ کیا جانے کس طرف کو گیا
ذرہ بھی گرد نہیں راہ میں غبار نہیں

وہ [illegible] یہ جو چلے ناصح
ہیں ہزار گرہ نہیں [illegible] نہیں ہزار کار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

فلک ہے وہ ستم کینہ ور خدا کی پناہ
عقاب [illegible] میں جسکے نہیں مہار نہیں

[illegible] غلط [illegible]
کوئی زمیں نہیں ایسی جہاں غبار نہیں

[illegible] دل میں تو دشمن [illegible]
[illegible] نکل چلے کیا [illegible] نہیں

غزل کہی [illegible] ظفر
وہ کون [illegible] شمار نہیں

نہ اہل دل سے نہ اہل نظر سے پوچھتا ہوں
خبر وہاں کی ہر اک بے خبر سے پوچھتا ہوں

وفور شوق میں کھویا گیا ہوں میں ایسا
کہ نامہ لکھ کے پتہ نامہ بر سے پوچھتا ہوں

بتا یہ خواب کا عالم ہے یا ہے بیداری
یہ اپنی چشم حقیقت نگر سے پوچھتا ہوں

کوئی خبر نہیں دیتا ہے خاک جم کی مجھے
میں خشت گر سے کبھی کوزہ گر سے پوچھتا ہوں

میں وہ ہوں گرد پس کارواں قد آدم
کہ رہروؤں کا نشاں رہ گذر سے پوچھتا ہوں

اسی طرح مری آغوش سے اٹھا تھا کوئی
تڑپ تڑپ کے یہ درد جگر سے پوچھتا ہوں

عبث ہے خضر اگر ساتھ ہو لئے میرے
کہیں میں اس کا پتہ راہبر سے پوچھتا ہوں

کرشمہ اس کی نگہ کے کسی سے کیوں پوچھوں
یہ اپنے دل سے یہ اپنے جگر سے پوچھتا ہوں

ملا نہ نقش قدم تو رہرووں کا پتہ
میں اب غبار سر رہ گذر سے پوچھتا ہوں

بھرا ہے جام صبوحی کا شاخ گل کی طرح
پتہ چمن کا نسیم سحر سے پوچھتا ہوں

شمیم ہے جو جدا کیوں گل سے پیدا ہو
یہ حال بلبل شوریدہ سر سے پوچھتا ہوں

ہنوز حقیقت کا ذوق باقی ہے
جواب کچھ نہ ملا عمر بھر سے پوچھتا ہوں

جگر تھا میرا ابھی کیا ناوک ستم کے لئے
یہ آج قاتل بیداد گر سے پوچھتا ہوں

بتا تو عشق کا انجام ہو گا کیا اے نظم
مآل کار کو پیغمبر سے پوچھتا ہوں

جو دل کو پیس کے پھینکیں تو آرزو نہ کریں — جو پاؤں کاٹ کے بیٹھیں تو جستجو نہ کریں
وہ جا کے باغ میں غنچہ کا دل لہو نہ کریں — شہید سرو چمن کو کنار جو نہ کریں
نکالیں تیغ کہ یک سو ہو روز کا جھگڑا — رقیب مجھ سے لگی لپٹی گفتگو نہ کریں
وہ اشک کیسے کہ پھوٹے نہ جن سے پڑ جائیں — وہ داغ کیسے کلیجہ کو جو لہو نہ کریں
کہیں ہزار میں حق ہم وہ تیغ عریاں ہیں — کسی کا منہ نہ کریں پاس آبرو نہ کریں
جناب شیخ کے زہد و ورع کو دیکھ لیا — کٹیں یہ ہاتھ جو اب بیعت سبو نہ کریں
گلہ نہ شکوہ کہ وہ لب سی لب ملائے ہیں — دہن پہ مہر یہ کی ہے کہ گفتگو نہ کریں
قسم یہ دیجے میں کہتا ہوں آرزوؤں سے — مرا لہو پئیں دل اگر لہو نہ کریں
حریف نکلے نہ چھریاں لگائیں بس مجھکو — شراب حلق سے اترتی ہوئی لہو نہ کریں
وہی ہے سامنے مڑ کر جدھر جدھر دیکھو — وفور شوق میں کیوں سجدہ چار سو نہ کریں
مرا غبار یہ اٹھ اٹھ کے کہتا ہی سر راہ — کہ پاؤں چلتے ہوں ور تیری جستجو نہ کریں
گناہ گار کو آتی ہے منہ دکھلاتے شرم — ہماری لاش کو احباب قبلہ رو نہ کریں
وہ پاک عاشق شوریدہ سر ہوں میں کہ کبھی — حسین جہاں کے مرا ذکر بے وضو نہ کریں
جو دل پہ رکھیں تو رکھیں نہ دلمیں کوئی ہوس — جو دل کریں تو کسی شئے کی آرزو نہ کریں
جہاں کو رہ گذر عاریت اگر سمجھیں — مقام پھر کوئی دم مثل آب جو نہ کریں
لا ہی یہ گل صد برگ سی سبق ہم کو — ہزار بھی ہوں زبانیں تو گفتگو نہ کریں
نماز میں نہ ہمیں قتل نفس ہو منظور — تو آستین الٹ کر کبھی وضو نہ کریں

نکل گیا کسی صحرا میں نظم آخر کار
جو یوں گیا اسی جانے دیں جستجو نہ کریں

۱۰۵ ـــــــ فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات ـــــــ ۲۰

چھٹکی ہی چاندنی سی دل پاکباز میں
ہی داغ سجدہ چاند جبین نیاز میں

آئی تھی بوئی ناز جو عرش نیاز میں
خاموش مثل شمع ہوں سوز و گداز میں

کچھ مجھ کو یہ خیال بھی ہی مشق ناز میں
پامال ہو گیا کوئی اس ترک تاز میں

جو شوخیاں ہیں خامہ افسوں طراز میں
وہ خوبیاں نہیں ہیں زبان طراز میں

ڈھیلے پڑی ہیں بند قبا خواب ناز میں
نقد وصال ہی گرہ نیم باز میں

نیچی نظر ہے شرم کی اونچی ہے قہر کی
بچتا نہیں شکار نشیب و فراز میں

دل لیکے بھول جانیکی عادت ہے آپ کو
اب کے گرہ لگائے زلف دراز میں

دل میرا اس طرف ہی ادھر دل رقیب کا
دونوں کو تولیے نظر امتیاز میں

بے پردہ ہو گیا ہی تجلی سی حسن یار
ہے طاقت نگاہ کسی دیدہ باز میں

تیری زباں سی آگ لگی شمع انجمن
میری زباں کو دخل نہیں میری راز میں

تقدیر کے لکھے کو نہ ہرگز برا سمجھ
لغزش محال ہے قلم کارساز میں

پردہ میں نغمہ زن ہے تو دھوکا ہی رہ گیا
ہے جسم میں یہ روح کہ آہنگ ساز میں

کہتی تھی آج شمع سحر مجھ کو دیکھ کر
جیتے ہو کس طرح سی غم جانگداز میں

پھانسی لگا رہی ہی اجل کیا بری طرح
الجھا کے رشتہ ہائے امید دراز میں

ہوں میں تو ناتواں مجھے کیونکر نہ خوف ہو
پھنستے ہیں شیر دام گرحرص و آز میں

خالی نہیں فریب سے عیش اس جہان کا
ساغر شراب کا ہے کف شیشہ باز میں

اس بحر پرخطر میں وہ نہیں جس کی موج سے
ڈر کر ہو سوار تلاطم جہاز میں

وہ صید پرشکستہ ہوں پائی ہے یہ شرف
میں نے ہوائے بال و پرو شاہباز میں

تسبیح اوسے بعد پڑہی بھی تو کیا حصول
سو مرتبہ خدا کو جو بھولا نماز میں

تھا طاعت خدا میں بھی یہ حال نظم کا
تصویر ایک کی رہی جا نماز میں

۱۰۶

۱۵

سرمہ قضا سے عشوۂ سحر آفریں نہیں
جادو کی ہے یہ پوری نگہ شرمگیں نہیں

وہ دن ہے کونسا کہ میں اندوہگیں نہیں
ہے دل تو سے کے پاس یہ آفت کہیں نہیں

رکھتے کہیں ہو پاؤں تو پڑتا کہیں ہے یہ
سنبھلو زمیں ہے یہ فلک ہفتمیں نہیں

چنبر کیطرح رنگ بدلتا ہے آسماں
کیونکر کہوں کہ نالہ دل آتشیں نہیں

او تنگ دل یہ ہاتھ خزانہ کا سانپ ہے
افعی کی کینچلی ہے تیری آستیں نہیں

سر میں بھرا ہوا ہے تیری بادہ غرور
موج شراب ناز ہے چین جبیں نہیں

سرمہ سے کر دیا ہے سخن گو غزال کو
کم سامری سے غمزۂ سحر آفریں نہیں

پینے میں خون دل کے حلاوت کچھ ایسی ہے
حیراں ہوں شکر ہے یہ یا انگبیں نہیں

جنت میں لطف کوچہ دلدار کا سہی
لیکن وہاں مزار کے قابل زمیں نہیں

کہتا ہے حال قبر کا دوزخ کا خلد کا
واعظ کے سر پہ تو کہیں روح الامیں نہیں

مجھ سا گناہ گار سزاوار لطف ہو — جنت بھی مل چکی مگر اب تک یقیں نہیں

آ لے اگر کرے تو اڑاؤں گا خاک میں — یا آج آسماں نہیں یا زمیں نہیں

چھپکے جا نکلے ہجر کی شب میں تو کس طرح — او چھل ذرا نگاہ سے وہ مہ جبیں نہیں

دوزخ میں میں ملک کے پکاروں کو یا کریم — آئے نہ تجھکو رحم یہ ہرگز یقیں نہیں

اے نظم کون حسن کسی سے چھوٹ رہا

١٠٧ —— قرآں اٹھائے شیخ تو ہم کو یقیں نہیں —— ١٤٣

کیا ہو یقیں ملیگا وہ ہم کو یہاں نہیں — اپنا ہی اس جہاں میں نہ پایا نشاں کہیں

مژگان تر سی تجکے چلے اے امیر سحاب — ڈرتا ہوں اڑ نہ جائیں تری وحشیاں کہیں

یارب وہ تیرگی شب غم کی ہوئی نمود — پہنچائے یہ سمٹ کی نہ بیل دواں کہیں

سمجھے تھے ہم کہ سجدہ طاعت ادا کیا — دیکھا تو سر کہیں ہے ترا آستاں کہیں

گنبد میں آسماں کے چھپا تھا قضا سے میں — کیا جانتا تھا یہ نہ ملے گی اماں کہیں

باتیں بنا بنا کے وہ مکرے تو کیا عجب — جس نے کہ ایک بات میں سو سو کہانیاں کہیں

وقت عروج شیشہ سے نازک ہو ذرہ سے — پتھر کی سل ہے یہ نہ خواب گراں کہیں

کیا سر کے بل گئے ہیں عدم کی سفر میں لوگ — اس راہ میں قدم کا نہ پایا نشاں کہیں

آواز ایک کی نہیں جا سکتی ایک تک — نالاں ہوں میں کہیں ہے جرس کارواں کہیں

لے چل مجھے بھی اے شب عشرت تو اپنے ساتھ — ڈرتا ہوں میں قصاص نہ لے آسماں کہیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا — بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

عالم یہ تحیر میں ہے کہ بیٹھی کہیں ہیں ہم | اور دل ہے کہیں خیال کہیں ہے گماں کہیں

اے نظم سنائے کاٹ کر پلٹیو تو کیا ہے غم
ہاں دیکھنا پلٹ کے نہ کاٹے زبان کہیں

١٠٨ ———— ١٥

١ تیور قدم قدم پہ مجھے آئے جاتے ہیں | اور دل کے ولولے ہیں کہ دو ڈر اٹھائے جاتے ہیں
٢ شکر روزگار بنا کا گلو نسے تو | وہ سانپ ہیں کہ دوش پہ بل کھائے جاتے ہیں
٣ کیا پھر پھڑ ار ہا ہے دل نہ ار رشک سے | وہ مرغ نامہ بر کو جو پھڑکائے جاتے ہیں
٤ آہ آسماں پہ جا کے ٹھگی لگاتی ہے | تلے فراز عرش کو ٹھہرائے جاتے ہیں
٥ گویا لگا گیا ہے ستاروں میں آفتاب | جتنے حسین ہیں سب وہی جھلکائے جاتے ہیں
٧ دیوانہ میں ہوں اب کہ میں ہے جو کوئی بتائیے | سمجھے نہ سمجھے کوئی وہ سمجھائے جاتے ہیں
٨ آنکھوں میں رہتے تھے وہ دل میں سما گئے | پائی جگہ تو پاؤں کو پھیلائے جاتے ہیں
٩ سمجھے تو اس مزاج کا میں اہل کرم کی ہوس | دیتے ہیں اور آپ ہی شرمائے جاتے ہیں
١٠ تھا دیکھتی ترے بام بلند کو | پیکر فلک کی آج تلک آئے جاتے ہیں
١١ بجو لگ کے پاس مسیح ہنڈولے میں چرخ کے | ہم دور ہی سے دیکھ کے تو ہلائے جاتے ہیں
١٢ بچھڑی سوال کر کے نکیرین دنگ ہیں | حاضر جواب ہو نہ سکے گھبرائے جاتے ہیں
١٣ یا ملک ہے جو بال سے دریش ہے وہ راہ | اور پاؤں مارے خوف کے تھرائے جاتے ہیں
١٥ باندھی ہو کمر یہ ٹھہرنے کی جا نہیں | ہم چلتے چلتے بات یہ سمجھائے جاتے ہیں

١٧ سب قافلہ تو جا بھی چکا نظم اب تو چونک
ایسے میں کچھ نشان قدم پائے جاتے ہیں

١٥ مفعول فاعلاتن دوبار ١٠٩

اس واسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں
مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

یہ دل کے پار ہو کر پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں
تیر نگاہ اس کے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اک لہر میں نہ سمجھے ہم کیوں اے حباب دیکھا
یوں آنکھ بند کرکے ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

طرز کرم کی شاہد ہیں میوہ دار شاخیں
اس طرح سر جھکا کر سائل کو ڈھونڈتے ہیں

ہے وصل ہجر اپنا اے قیس طرفہ مضموں
محمل میں بیٹھے ہیں اور محمل کو ڈھونڈتے ہیں

طول امل کا رستہ ممکن نہیں تو طے ہو
منزل پہ بھی پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

حسرت شباب کی ہے ایام شیب میں بھی
معدوم کی ہوس ہے زائل کو ڈھونڈتے ہیں

اٹھتے ہیں وہ لوٹے کچھ ہر بار درد بنکر
کیا جانیے جگر کو یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

زخم جگر کا میرے ہے رشک دوستوں کو
مرتا ہوں میں کہ یہ کیوں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اہل ہوس کی کشتی یک بام و در ہوا ہے
دریائے عشق میں بھی ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

آیا جو رحم مجھ پر اس میں بھی چال ہے کچھ
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اب دل کو ڈھونڈتے ہیں

کرتے ہیں کار فرہاد آساں زمیں میں بھی
مشکل پسند ہیں ہم مشکل کو ڈھونڈتے ہیں

اے خضر بے خجستہ بہر خدا کرم کر
بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

دل خواہ تیرے عشوے دل جو ترے اشارے
وہ دل ٹٹولتے ہیں یہ دل کو ڈھونڈتے ہیں

اے نظم کیا بتائیں حج و طواف اپنا
کعبہ میں بھی کسی کی محمل کو ڈھونڈتے ہیں

۱۱۰ کیا کارواں ہستی گذرا روا روی میں ۲۰
فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار دی میں
تھے محو لالہ و گل کس کیف بیخودی میں
زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں
یاران بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تمکو
تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی میں
ہر عقدہ میں نہاں ہے پوشیدہ ہے کشائش
ہے موج خندہ گل پنہاں کلی کلی میں
زخموں میں خود چھپا ہے اور اس پہ یہ ستم ہے
رنگ پریدہ سے میں رہتا ہوں چاندنی میں
ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی
یہ انتہا نہ پایا آشوب آگہی میں
حکم قضا ہو جیسا سرزد ہو فعل ویسا
بندہ کا دخل بھی ہے پھر اس کی ہی بدی میں
رفتار سایہ کو ہے پست و بلند یکساں
ٹھوکر کبھی نہ کھائیے راہ فروتنی میں
وجد آگیا فلک کو غش آگیا زمیں کو

دو طرح کے اثر تھے اک صوت سرمدی میں

تعبیر اس کی شاید ایک ایسی نفس ہو
جو خواب دیکھتے تھے ہم ساری زندگی میں

لائی حباب تک کو سیل فنا بہا کر
اک آہ کھینچنے کو ایک دم کی زندگی میں

محشر کی آفتوں کا دھڑکا نہیں رہا اب
سو حشر ہم نے دیکھے دو دن کی زندگی میں

پہلو میں تو ہو اے دل پھر حسرتیں ہزاروں
کس بات کی کمی ہے تیری سلامتی میں

پرسان حال وہ ہو اور سامنے بلا کر
کیا جانئے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں

تو اک طلسم ہستی پھر کیسی خود پرستی
سایہ کی پرورش ہے دامان بیخودی میں

حائل بس اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں
پردہ حباب کا ہے فردا میں اور دی میں

آنکھیں دکھا رہی ہے دن سے مجھے شب غم
آثار تیرگی کے ہیں عون کی روشنی میں

تو نے تو اپنے در سے مجھ کو اٹھا دیا ہے
پرچھائیں پھر رہی ہے میری اسی گلی میں
سجدہ کا حکم مجھ کو تو نے تو اب دیا ہے
پہلے ہی لکھ چکا ہوں میں خط بندگی میں
اے نظم چھیڑ کر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں
کیا جانتے تھے ظالم رو دیگا دل لگی میں

11 فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات 111

صبح غم کی یہ شعاعیں نشتر سے کم نہیں
چاک داماں سحر چاک جگر سے کم نہیں
حسن کی ترکیب دیتی ہے گلستاں کا جواب
قد شجر سے کم نہیں اعضا ثمر سے کم نہیں
زلف کا چہرہ پہ آنا ہے ستم ہنگام دید
ایک لمحہ بھر بھی مجھکو رات بھر سے کم نہیں
جھک گیا ہوں ضعف سے گردش ہی قسمت میں ہے
پاؤں کا چکر مرا دستار سر سے کم نہیں
میری از خود رفتگی بے روئے کم ہوتی نہیں
آپ میں آنا بھی دریا کے سفر سے کم نہیں

سجدہ کرتا تھا وہاں میں سر ٹپکتا ہوں یہاں
آستانِ یار بھی کعبے کے در سے کم نہیں

کیا بتاؤں بادیہ پیما ہوں میں کس راہ میں
پاؤں میں جو آبلہ ہے وہ گہر سے کم نہیں

دل پہ بل کھانا ستم کا ہے بلا کا پیچ و تاب
بال بال اس زلف کا موئے کمر سے کم نہیں

اس میں رہتا ہے کسی کے روئے روشن کا خیال
خانۂ دل اپنا آئینہ کے گھر سے کم نہیں

انتہا رکھتا نہیں ہے گو شبِ فرقت کا طول
لیکن اپنا رنگ اڑ جانا سحر سے کم نہیں

سنگ پہ منہ رکھ کر جو رویا پہنچے گوش یار تک
نظمؔ اپنا ایک ایک آنسو گہر سے کم نہیں

۲۵ ۱۱۲

یاس و امید اس طرح ہے خاطرِ دلگیر میں
ہو اندھیرا اور اجالا جس طرح تصویر میں ۷

دم بھی لے سکتا نہ انساں گردشِ تقدیر میں
گر کشش ہوتی نہ اتنی خاک دامن گیر میں

باڑھ پیدا آنکھ کے برسنے کی شمشیر میں
دیکھیے پلکوں کی صف نے پر لگائے تیر میں
دم نہیں ہے صید گاہِ حسن کے نخچیر میں
آرزوئیں دل میں ہیں دل ہے کسی کے تیر میں
ہو چکے ہیں خاک دونوں ہے ہوا چلنے کی دیر
صلح ہو جائیگی اب دارا و عالمگیر میں
عشق سکھلاتا ہے جو یک روح و دو قالب کا عمل
جان اپنی ڈال دیتے ہم تری تصویر میں
صید کے دھوکے میں کیا جانے کیا تھا کس کو قتل
ڈال دیں قاتل نے باہیں گردنِ نخچیر میں
ابروؤں میں تیرے ظالم اور کماں میں فرق ہے
کام ہوا کے اشارہ میں تو اس کے تیر میں
رات کو تارے کھلے تھے صبح کو کلیاں کھلیں
واشدِ خاطر نہ تھی اک میری ہی تقدیر میں
وصف تیرا ایک سے بھی ہو نہیں سکتا بیاں
ہے زباں تقریر میں عاجز قلم تحریر میں
خرمنِ صبر و سکوں کی یا الٰہی خیر ہو

آج بجلی کی چمک ہے آہِ بے تاثیر میں
کعبہ و بت خانہ عارف کی نظر سے دیکھیے

خواب دونوں ایک ہی ہیں فرق ہے تعبیر میں
اُس کی ایک ایک بات کو دیتا ہوں میں سو سو جواب

طولِ موسیٰ نے دیا تھا جس طرح تقریر میں
آپ سے ہو کر مخاطب میں ایسا ہو گیا

غرض مطلب کو میں بھولا لذتِ تقریر میں
میں اگر زنداں سے اُٹھا جان لے محشر اُٹھا

اے جنوں شورِ قیامت ہے میری زنجیر میں
کہکشاں کے حلقہ حلقہ سے یہ مضموں ہے عیاں

باندھ کر رکھا ہے فیلِ مست کو زنجیر میں
جس قدر تڑپا اسیری اس قدر بڑھتی گئی

طوق آخر کو ادھر کر رہ گیا زنجیر میں
سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو زنگیں کر دیا

ایڑیاں رگڑیں تو.... صیقل ہو گئی زنجیر میں
کم نہیں رختِ عروسی سے محرم کا لباس

لاکھ زیور کا مزہ ہلکی سی اک زنجیر میں

کھل پڑے گیسو تو بند ہنا اک مصیبت ہو گیا
زلف ہیکل میں کبھی اولجھی کبھی زنجیر میں

زلف کے سودے میں آیا اوسکی آنکھوں کا خیال
اور دو حلقے زیادہ ہو گئے زنجیر میں

ہو رہی ہے قصر تن کی مہر و مہ سے پرورش
اوٹھ رہی ہیں درہم و دینار اس تعمیر میں

بڑھ کے کاجل سے بھی تجھ کا جل کا لگنا ہے ستم
سرمگیں آنسو لگا دیتا ہے پیکاں تیر میں

اس نے دیکھا جب لگا کر دانت پر تلوار کو
آب گوہر مل گئی آب دم شمشیر میں

تجھ سے ہم کہتے تھے اے نظم ستم پہ اُف نہ کر
ہو گیا کفران نعمت شکوہ تقدیر میں

۱۱۳ ۲۲

نور دل سے عشق کے بے پردگی ہوتی نہیں
اک چمک اوٹھتی ہے لیکن روشنی ہوتی نہیں

آئینہ دار خیال یار ہے جوش سرشک
کون سا شیشہ ہے وہ جس میں پری ہوتی نہیں

سو کے اوٹھنے کا ترے کچھ اور ہی انداز ہے
اس طرح خورشید کی تیوری چڑھی ہوتی نہیں
جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیسا دیکھکر
صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مسی ہوتی نہیں
کیا کہوں میں توڑتا شیشے سے ٹکرا کر اوسے
تو یہ زاہد بوقت میکشی ہوتی نہیں
وصل کی شب دل ہے میرا اور کسی کی کروٹیں
دیکھوں تو پامال حسرت کونسی ہوتی نہیں
شکوہ بیداد پر کیا ہو تلافی کی امید
ناز ہوتا ہے اوسے شرمندگی ہوتی نہیں
آنکھ بھر کر دیکھنے سے اوس کے جو ہوتا ہے حال
ساغر سرشار سے یہ بیخودی ہوتی نہیں
دیدہ حیراں کے آگے ہوتی ہیں جو شوخیاں
محرم اس ناز و ادا سے آرسی ہوتی نہیں
ہے شب غم میں زمانہ میری نظروں میں سیاہ
کہہ رہا ہوں آج ابتک روشنی ہوتی نہیں
گوشہ عزلت ہے جز رو مد عالم سے الگ

غم یہاں مرنے کا جینے کی خوشی ہوتی نہیں

یہ مرض ہستی کا اے خضر اور بے رہبر تم
پی گئے آب بقا اب زندگی ہوتی نہیں

دل اٹھا لینے میں دنیا سے وہ ملتا ہے مزہ
اہل دل کو اس سے بہتر دل لگی ہوتی نہیں

دولت کونین ملتی ہے جو طالب ہوں ابھی
اپنی ہمت ہی کہ اب تک ملتجی ہوتی نہیں

شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہی ساتھ
کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں

ملکے ابنائے زمانہ سے ملے کیا مجھکو لطف
دوستی سمجھتی نہیں ہے دشمنی ہوتی نہیں

آسیائے چرخ ہے مدت سے اور عظم رمیم
قسمت اجزا ابھی تک منتہی ہوتی نہیں

سیدھی سادی راہ کوئی بیکسی کی راہ ہے
بیچ میں دیوار گردا گرد سی ہوتی نہیں

آئینہ کی طرح سب سے دل کو رکھا ہو اصاف
خوب ہو یا زشت مجھ سے بیرخی ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ یک دل یک زباں ہو ساری خلق
جب کہ دو شخصوں کی صورت ایک سی ہوتی نہیں

پڑ گیا ہے پھیر کہ معرفت کی راہ میں
دوڑتے سب ہیں رسائی ایک کی ہوتی نہیں

اس زمیں میں اور کچھ اشعار رندانہ سنا
نظم اہل ذوق کو سیری ابھی ہوتی نہیں

۱۲ ۱۱۴

دل نہ ہوتا اگر تو پھر کچھ دل لگی ہوتی نہیں
غم کبھی ہوتا نہیں حسرت کبھی ہوتی نہیں

لوٹتے رہتے ہیں تجھ پر جلنے والوں کے دل
ورنہ یوں پوشاک تیری ملگجی ہوتی نہیں

دور ہیں فصل خزاں کے آشیاں سے کیا غرض
پھونک دیتے ہم اگر بجلی گری ہوتی نہیں

کاتباں نامۂ اعمال نے دھرا دیا
ہم مکر جاتے اگر لکھا پڑھی ہوتی نہیں

دل رہین عشق ہو کر مال ان کا ہو گیا
پھیر لیتے ہم اگر آئی گئی ہوتی نہیں

ہجر کی تاریک راتیں تھیں جو قسمت میں مری
کاشکے یہ چار دن کی چاندنی ہوتی نہیں

خون پی کر غم نہ کر دیتا اگر صید زبوں
اے اجل تجھ سے کبھی شرمندگی ہوتی نہیں

در کھلے ہیں آسماں کے می پرستوں کے لئے
ورنہ یوں تکلیف از خود رفتگی ہوتی نہیں

ہو گیا زنگ تعلق مانع سیر و سلوک
دوڑتے کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوتی نہیں

پھر اگر بیجا خزاں سی جھک کے ہم کرتے سلام
سرو گلشن میں جو اتنی راستی ہوتی نہیں

ملنے والا تھا دل حسرت زدہ جس دن مجھے
کاش عالم میں وہ ساعت وہ گھڑی ہوتی نہیں

نظمؔ جب تک ہو سکے ترک تشخص چاہیے
ہم خدا تجھ کو سمجھتے گر خودی ہوتی نہیں

۹ ولہ ۱۱۵

حرص را خون کردن و دل را تونگر داشتن
ایں عمل کم نیست از کبریت احمر داشتن

نسخهٔ تسخیر دلهای جهان دانی که چیست
حرف شیرین و زبان لعل موج کوثر داشتن
ای که میداری سفر در پیش و منزل جهان آمده
زاد راه است ولی از لذتهای جهان برداشتن
تا نهادستی جبین عجز بر خاک نیاز
پس ترا زیباست سر تا آسمان برداشتن
بر سر آوردن سپهر و زانحوال گاه وقت
هست چون داغ سوالی به کف داشتن
تا توانی دور کن زنگ هوس از تماشاست
ورنه آسان نیست چون آئینه جوهر داشتن
شیشهٔ شک و دره تقوی نمیدانی که چیست
خار در پیراهن و نشتر به بستر داشتن
تکیه بر لطف خداوندی که هست آمرزگار
بهتر از اندیشهٔ کردار و کیفر داشتن
روش احمد هست معراج امیر بت شکن
پس چه حاجت اندرون کعبه و منبر داشتن

امن اس دور قمر میں فلک پیر نہیں
ہی کف افعی شب کاسۂ زر تیر نہیں

دل میں سمجھے ہوئی ہیں اپنے کہ ہم بھی کچھ ہیں
خواب وہ دیکھا ہی جسکی کوئی تعبیر نہیں

سیف قاطع ہی یہ شہ کے لئے احکام قضا
ہی یہ بسمل کی تڑپ حیلہ و تدبیر نہیں

آفریں خامۂ نغمہ و رنگیں گفتار
عندلیبوں کے ترانے ہیں یہ تحریر نہیں

باغ سبز اپنا دکھا ہمکو نہ ای طول امل
سمجھے بیٹھے ہیں کہ وقفہ نہیں تاخیر نہیں

دم شماری میں گزر جاتی ہی انسانکی عمر
اس میں تقدیم ذرا بھی نہیں تاخیر نہیں

۱۱ ——— ۲۴

آپ کو میرے دل زار سے کچھ کام نہیں
خیر تو ہیں سہی یکرار سے کچھ کام نہیں

مشغلہ یہ بھی رہا دست جنوں کا چندی
اب گریباں کے کسی تار سے کچھ کام نہیں

زخم سی دور جو سینہ پہ چھری ہوئی بیٹھی ہیں
ہیں مسیحا جنھیں بیمار سے کچھ کام نہیں

رشک انجم سحری ہی تیرا آویزۂ گوش
اس ستارہ کو شب تار سے کچھ کام نہیں

مجھکو طوطی کی طرح ذوق نوا سنجی ہے
ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں

وعظ کہنے کو چلے آئی ہیں میخوار و نمیں
شیخ کو خانۂ خمار سے کچھ کام نہیں

ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں
خلش وادی پرخار سے کچھ کام نہیں

شعلۂ شمع نہیں ہیں یہ ہوا دان نسیم
مجھکو خار سر دیوار سے کچھ کام نہیں

قلزم عشق کا پیراک نہیں ہیں نہ سہی
ڈوب مرنا ہی تو منجدھار سے کچھ کام نہیں

کھلتا ہی راز نہاں آتش جاں سوز ہو میں
اور زباں کہتی ہی اظہار سے کچھ کام نہیں

آنکھ بھر کر نگہ مست سے وہ دیکھے تو ہے — مجھے ساغر سرشار سے کچھ کام نہیں
تیغ کھینچے ہوئے رہتی ہے ادا ہر لحظہ — ہے ستم یہ کہ گنہگار سے کچھ کام نہیں
نفس بد کیا مجھے دنیا کی طمع دنیا ہے — تیرے فاقہ بھی مردار سے کچھ کام نہیں
ہیں طلبگار تجلی نہیں موسیٰ کی طرح — آتش لالہ کہسار سے کچھ کام نہیں
مرکز صبر و سکوں زیر قدم ہے اپنے — گردش گنبد دوار سے کچھ کام نہیں
سعد و نحس اپنا ہی اپنا ہی سکون و حرکت — کوکب ثابت و سیار سے کچھ کام نہیں
اپنا منہ اشک ندامت میں نظر آتا ہے — مجھ کو آئینہ پندار سے کچھ کام نہیں
اس کو پھرتی ہوئی دیکھا تھا الٰہی جو شاید — اڑ گئے سرو کی رفتار سے کچھ کام نہیں
اس کے جانے ہی چلی جاتی بھی کبھی گھر سے مرے — کہ مجھے اب در و دیوار سے کچھ کام نہیں
نیند آتی ہی تو یہ کہہ کے چلی جاتی ہے — کہ مجھے دیدۂ بیدار سے کچھ کام نہیں
موج ماری جو غم دل تو فلک تک پہنچی — اس کو لیکن لب اظہار سے کچھ کام نہیں
رہزنی میں زن دنیا کا سلیقہ دیکھو — کہ اسے مرد سبکبار سے کچھ کام نہیں
کہہ دیا منکر رویت ہیں نافہموں نے — طالب وصل ہیں دیدار سے کچھ کام نہیں

میں جگر بند پیمبر کا ہوں شیدا ای نظم
پسر ہند جگر خوار سے کچھ کام نہیں

۱۱۸ — ۱۰

کچھ غبار دل شیدا کی خبر ہے کہ نہیں — نظر آئینہ پروانہ دھرے ہے کہ نہیں

بزم ہونے کو ہے برہم یہ خبر ہے کہ نہیں
دیکھنا رات کچھ اس شمع سحر ہے کہ نہیں

ناز کھو نگہ یہ ہو گئی سو کو تو بڑھکر دیکھے
لب وہی ہیں پہ وہ جھکانی کمر ہے کہ نہیں

پھر وہ نت ہم گلے ان کے کھنا دیکھو
پھول مرے سر کی قسم درد جگر ہے کہ نہیں

تجھکو نالوں سے ہو فرصت تو پوچھوں بلبل
دل لگاوٹ کا ترا نہیں ٹھہرے ہے کہ نہیں

ہے شب عشق کو ماتم مرے نالہ کش نیں
دیکھیو جا کے گریبان سحر ہے کہ نہیں

رات پھر اشک بہا آنکھ نہیں کیونکر تھیں
دیکھ دامان و گریبان تر ہے کہ نہیں

ہم تو پھر آنکھ پھرا لیتے ہیں تو دیکھو
آج اک ہم پہ محبت کی نظر ہے کہ نہیں

اور جو راز تجھے پنہاں وہ کھلا دل کی نشاں
یہ نہ معلوم ہوا ہم کو خبر ہے کہ نہیں

ہائے افسوس نہ کہنا مرا انا احسان
یار جیوا میرا محبت میں ضرر ہے کہ نہیں

۱۴۹

خم گیسو میں دل زار کو ہم دیکھتے ہیں
کس شکنجے میں گنہگار کو ہم دیکھتے ہیں

ہم نکلنے ہی نہیں پاتے آنکھ سے کچھ گلی میں اپنی
پھر وہ ترے اقرار کو ہم دیکھتے ہیں

بیٹھے سیر کو ہیں دشت لطف و خاک
سایہ قبا سبزہ و گلزار کو ہم دیکھتے ہیں

کچھ نہیں اس کے جو گلستان نظر آتا ہے
کس نظر سے در و دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

ہائے کیا ہو گیا موقوف فلک کا پھرنا
ایک نہ ایک پشت تار کو ہم دیکھتے ہیں

اتنی قابو میں جمع آ جا دل زار اپنا
پھر تری گرمی بازار کو ہم دیکھتے ہیں

صبح نو سے ٹپکنے ہی ہو گی لیکن آج گرتے ہوئے دیوار کو ہم دیکھتے ہیں
نظم اب ترک محبت کا زمانہ ہے قریب
اور جانب نگہ یار کو کم دیکھتے ہیں

۲۱ مفاعیلن چار بار ۱۳۰

نفس جب تک ہے آنکھیں دیدۂ واد یجہاں کر لیں
بندھا ہے تار یہ جب تک تماشا تیلیاں کر لیں
اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
نفس کو خونفشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں
کرنہ اپنا سخندانی سے گردوں قتل کے درپے
جو کہنا ہو وہ کہہ سن لیں جو کرنا ہو بیاں کر لیں
سفر تو اس قدر ہو دور کا اور پھیر کا رستہ
مناسب تھا کہ اپنے ناقہ کو محمل کو گراں کر لیں
حسینوں کی بہار حسن ہے مہمان دو روزہ
ادائیں گرمیاں کر لیں نگاہیں شوخیاں کر لیں
ضعیفی میں نہیں ہم کو شکایت قد کے جھکنے کی
زمیں سے کچھ دنوں فریاد جور آسماں کر لیں
غرض ہے کسب عرفاں مجھکو سخانہ میں آنے سے

جنھیں طوفاں اُٹھانا ہو وہ جو چاہیں گماں کر لیں
نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائیگاں کر لیں
خضر کو فاتحہ دینی ہے گر ہم خاکساروں کی
تو پہلے چشمۂ آبِ بقا سے کُلّیاں کر لیں
خبر اس کی نہیں تھی دامِ زیرکاہ پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں
ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے
تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں
عجب کیا گر نہیں ملتا مرے سینہ میں تیر اُن کا
وہ ناوک پر قیاس معنیٔ خاطر نشاں کر لیں
نہ ہو کوئی ہنر انساں میں اک شیریں زبانی ہو
یہ افسوں پڑھ کے دشمن کو بھی ہم تو مہرباں کر لیں
ہماری رندی و مستی تو قابلِ منع کے ٹھہری
سرِ منبر بھلا واعظ تو ٹھنڈی گرمیاں کر لیں
سمجھتے ہیں کہ جینا نزع کی حالت میں بھی اچھا
جو بس ہو تو اجل کو کچھ دنوں ہم میہماں کر لیں

بھلا کیا فائدہ اہل جہاں سے ہم سخن ہو کر
اثر اتنا تو ہو آخر کسی کو ہم زباں کر لیں

ہمیں اس بزم میں درد محبت گر نظر آئے
کلیجہ میں چھپا لیں اس کو آنکھوں سے نہاں کر لیں

مسیحا اُٹھ۔ لے بالیں سے ذرا پھر تم ہیں اور تو ہے
ٹھہرا ے درد دل اتنا کہ ذکر درد دل بیاں کر لیں

چلا میں بزم سے پھر ذکر میرا نامناسب ہے
شکایت میری جو کرنا ہو مجھ سے مہرباں کر لیں

ہوا جب کہ ثابت عیش دنیا کا خیالی ہے
خیال عیش سے لازم ہے دل کو شادماں کر لیں

خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظم بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کر لیں

۲۰ ۱۲۱

گزرتے ہیں تو مثل سیل عالم سے گزرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثل نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں

صبا کی طرح پھیرا کو چۂ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گزرتے ہیں

یہ بھی نسبت مستی کی تو کیا تو نے نگر بار رب
لگا دیتے ہیں تہمت جیسے چھپا جیسے دھرتے ہیں

ہوس نے زیست کی آتش پر اک آنا ہو آتش سے
کہ گرمی سے پگھل جاتے ہیں سردی سے ٹھٹھرتے ہیں

وہ کیا جانیں جو ہیں ناآشنا لذت سے قناعت کی
کہ یہ ٹکڑے نوالے حلق سے کیونکر اترتے ہیں

نظر ہے ان پہ حسرت سے نفس سے بستی ہمت
کوئی مرنے سے ڈرتا ہو گا ہم جینے سے ڈرتے ہیں

بڑی مشکل ہے ہو جائے نہ ٹوٹی توبہ زاہد
شکست سنگ کا الزام ہم شیشہ پہ دھرتے ہیں

عنادل ان کے بن پاک ہیں خو کیا حیران کو
کہ شاخیں جھکتی ہیں پھول ترتیب پر بکھرتے ہیں

یہ عادت کیا انہیں سے سیکھ لی ہے نکتہ چینوں نے
کہ جس پر آنکھ پڑتی ہے اس کو نام دھرتے ہیں

مروت تو بہت کی ہے یہ بےدردی نہیں اچھی
ادا ہو جا قیدی کہ مرنے دے جو مرتے ہیں

... شیشے نے سنگ کو توڑ ڈالا ۱۲

تمھارے گیسوؤں کی برہمی کیا پوچھتے ہو ہم سے
بگڑنے سے یہ بنتے ہیں بکھرنے سے سنورتے ہیں

حباب اٹھ کر قعر بحر سے تا سطح آب آیا
ابھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر ابھرتے ہیں

اگر فقر و غنی کے مسئلے کو غور سے دیکھو
تو سچ یہ ہے کہ دونوں لفظ بے معنی ٹھہرتے ہیں

قلم سے ذوق سجدہ جادۂ تسلیم میں سیکھو
جو ہیں اہل فنا یوں سر تہ شمشیر دھرتے ہیں

رہے ہوں دل ابھی جیب جگر سے صفائی کیونکر کہاں تک
کہیں یہ داغ مٹتے ہیں کہیں یہ زخم بھرتے ہیں

صدائے طبل تہی کی ہے یہ شہرت اور یہ آوازہ
ہوا میں بھر کے ارباب ہوس ناحق ابھرتے ہیں

یہی دل ہے تو جینا ہو چکا اب عشق بازوں کا
تماشا ہے کسی کی شکل اچھی ہو تو یہ مرتے ہیں

ضعیفوں کے قد خم گشتہ ظالم وہ کمانیں ہیں
کہ جن کے تیر پشت پیر گردوں سے گزرتے ہیں

۱؎ قعر بحر دریا کی تہ ۱۲

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحاں کر لے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں
پرائے دل کی حالت کو کوئی اے ظلم کیا جانے
سمجھتے ہیں وہی جو دل پہ اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

۱۲۲ ۱۶

تری محفل میں جو آتے ہیں کچھ کھو کر نکلتے ہیں
وہ ہر سو ڈھونڈتے اپنا دل مضطر نکلتے ہیں
شگوفے لے کے سر پہ طبلہ عنبر نکلتے ہیں
گل تر ساتھ سلگائے ہوئے مجمر نکلتے ہیں
بہار آئی اٹھا ہے جوش خون لالہ و گل میں
رگ سودا میں ہم ڈوب کر نشتر نکلتے ہیں
کسی کے مطلع ابرو کو ہم نے پڑھ کے دیکھا ہے
عجب انداز پایا ہے عجب تیور نکلتے ہیں
شب غم اک بلائے بد ہے تاریکی میں گنوں کیونکر
ستارے بھی کچھ اس کے سایہ سے بچ کر نکلتے ہیں
جنھوں نے دل لگایا ہی نہیں یہ لطف کیا جانیں
اجل کس طرح آجاتی ہے دم کیونکر نکلتے ہیں

نہ پوچھو کاوشِ مژگاں سی تیرے دل پہ کیا گزری
کہ یہ آنسو ہی ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

بیابانِ بلا کی راہ سیدھی مل گئی مجھکو
بگولے سیکڑوں کھاتے ہوئے چکر نکلتے ہیں

ہی اس بیمارِ غم کو دھن اوسی محفل مین جانے کی
مسیحا و خضر جس بزم سے مر کر نکلتے ہیں

بھری ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹکر تجھ میں
عرق جو شرم سے آیا وہی گوہر نکلتے ہیں

جو نا پا تو حسینوں کے قدم تک تھا سرِ محشر
یہ ظالم حشر کے فتنہ سے بھی قد بھر نکلتے ہیں

مری فریاد اور الٹے گلا میرا دباتی ہے
مرے نالے مجھی پر کھینچ کر خنجر نکلتے ہیں

بنائے جلتے ہیں کاجل کے دنبالے دمِ تزئیں
الٰہی خیر ہو تیر نگہ کے پر نکلتے ہیں

اشارہ ہی یہی اس شوخ کی ترچھی نگاہوں کا
انھیں گوشوں سے اکثر فتنۂ محشر نکلتے ہیں

نہیں کوشش سی کچھ دیوانگانِ عشق کو حاصل

کنواں کھودیں جو سر سے اس پہ بھی چھیڑ نکلتے ہیں

متاع صبر و ہوش اے ظلم تو ٹھیرا تو سے لیکر

خبر بھی ہے کہ اس رستہ سے غارتگر نکلتے ہیں

لعہ ۔۔۔ ۱۲۳

ثنائے ساقی کوثر پر اشعار تر نکلتے ہیں

زمین شعر سے بھی چشمۂ کوثر نکلتے ہیں

غنیمت ہے نفس کے ساتھ جو اخگر نکلتی ہیں

یہی ہیں ارمان اپنے دل کے رہ رہ کر نکلتے ہیں

ازل میں بزم ماتم عشق مہ و خورشید سے پوچھو

کہ جیب سے یہ نکلتے ہیں برہنہ سر نکلتے ہیں

زباں سے میری گر شکوہ نہیں نکلا نہیں نکلا

اک آہ دور شکست رنگ سو دفتر نکلتے ہیں

غبار آئے کسی کے دل میں تجھ سی کیا قیامت ہے

سنا ہوگا کہ اکثر گرد سے لشکر نکلتے ہیں

جہاں کو آئینہ سمجھیں طلسم قدرت حق کا

تو اک ذرہ سے سو بت خانہ آذر نکلتے ہیں

عبرت سے نقصان و کمال ماہ کو دیکھو

۱ تو سو شکوہ وزہ کے ۱۲

جو پہلے سر پہ ٹوٹتے تھے وہ دبلہ بکر نکلتے ہیں
ہوئے ویرانے اڑتی ہے محشر ہو کہ کوثر ہو
نفس میلوں میں ہم تخت سلیماں پر نکلتے ہیں
صدائے چنگ سنی مجھکو یہی آواز آتی ہے
یہ کہتا ہے کوئی پردہ سے ہم باہر نکلتے ہیں
گدائے بےنوائی ایک ٹھوکر سے جو گر اٹھے
ابھی اڑتے ہوئے دارا و اسکندر نکلتے ہیں
وہ نشانے ہیں جہاں میں داغ جو ہرگز نہ جوئیگا
یہ تیرے چند درہم اے فلک جو تجھ پر نکلتے ہیں
گذر جاتے ہیں یوں ہی روز سیہ ارباب ہمت پر
ستارے جس طرح بادل میں چھپ چھپکر نکلتے ہیں
نشان سوز غم باقی ہے میری خاک میں ابتک
دل پر داغ کے ٹکڑے ہیں جو اخگر نکلتے ہیں
کوئی دیکھے تو پہلے آپ سے باہر ذرا ہوکر
ابھی اس گنبد بے در میں صدہا در نکلتے ہیں
دل بے آرزو جب سے ملا اے نظم حیراں ہوں
کسی کے منہ سے حرف آرزو کیونکر نکلتے ہیں

کھٹک ہر سانس میں ہے ہر نفس کے ساتھ نالے ہیں
کہ دل نازک ہے میرا اور دل کے زخم آلے ہیں

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادائیں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

تری محفل میں مجھ سا کشتۂ حسرت نہیں کوئی
اداؤں نے مجھی پر جو چلے دل سے نکالے ہیں

حجاب آتے ہی مژگاں کی صفیں ہٹ جائیں گی باہم
یہ ترکان قدر انداز گھونگھٹ کھانے والے ہیں

طریق عشق میں ہر ہر قدم سے کام اثر ورنہ
وہاں اے کے چھالے ہیں جو تلوؤں کے چھالے ہیں

نہ پہونچے فیض اپنوں سے تو شکوہ اسکا کیا کیجئے
حباب بحر دست موج میں خالی پیالے ہیں

نہ ڈھونڈھیں گے کہیں اب خانۂ دل کے سوا اسکو
مکاں کعبہ سے لیکر عرش تک سب دیکھے بھالے ہیں

جنھیں تکیہ خدا پر ہو زیاں پر کیوں قدم رکھیں
مصلے آب پر دوش ہوا پر مرگ چھالے ہیں

ملیں وحشت میں جاگیریں مجھے فرہاد و مجنوں کی
گریبانوں کے پرزے کوہ و صحرا کے قبالے ہیں
تری تصویر کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی لیکن
مری آنکھوں میں اب تک کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہیں
الٰہی رہ گئی تھی خاک میں بھی آہ کچھ باقی
مری مٹی سی جو ساغر بنا ان میں بھی چھالے ہیں
ملال انگیز ہو جاتی ہے افراط طرب آخر
کہ اپنی حد سے نغمے جب گذر جائیں تو نالے ہیں
قلم کی طرح سجدے ہی کروں میں تو اگر پاؤں
کہاں وہ لوگ ہیں جو بات پر سر دینے والے ہیں
کرم سے اس کے ہیں سامان کیا کیا بادہ نوشی کے
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بھادوں کے جھالے ہیں
وہ نادان ہیں جو ملک و مال کو اپنا سمجھتے ہیں
کہ یہ آج اس کے قبضے میں ہیں کل اُسکے حوالے ہیں
وہ ایسے سال ہیں بوتل کا گاگا وڑتی ہیں کیفیت
عمامے زاہدوں نے مست ہو ہو کر اُچھالے ہیں
نہ چھوٹی مر کے بھی اہل جہاں سے ظاہر آرائی

کفن کے ٹکڑے کا اوڑھنا ہوست کے اوپر دوشالے میں
جہاں تو جلوہ گر ہووے ستم ہے جا فغاں کرنا
مجھے آتا ہے ان پر رحم جو دل کو سنبھالے میں
جو پہلے جا چکے اس بزم میں ان کو تو کیا رونا
پڑے ہیں جا کے پیچھے وہ کہ جو میرے ساتھ والے ہیں

۱۳ ۱۲۵

ہوئی یہ کثرت اندوہ و غم فصل بہاری میں
گریباں پر ہنسی آتی ہے انگشت گل کی سواری میں
مجھے فرقت کی شب ہے صبح سے اختر شماری میں
ستارے کہکشاں میں ہیں کہ دندانے ہیں آری میں
گریباں پھاڑتے گل کی طرح فصل بہاری میں
کہ دم گھٹنے لگا اب تو جنوں کی پردہ داری میں
حباب آسا ہیں ہم اے سراب دشت کچھ ہیں تو
کرو گے اعتبار آتی ہے اس بے اعتباری میں
مرے حصے میں جام جم نہ کیوں اس بزم میں آئے
کہ میں بھی تو ہوں یکتائے زمانہ بادہ خواری میں
جنوں تمکین سے کہتا ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا

تغیرِ آبِ راکد کی طرح سے [illegible] میں

اوٹھانی کو درو گوہر کے میں ہر اک سے جھکتا ہوں
مجھے کانِ جواہر مل گئی ہے خاکساری میں

اجل نے تو مجھے چھوڑا کہ اک صیدِ زبوں یہ ہے
یہاں دشوار جینا ہو گیا اس شرمساری میں

پشیماں ہونگے تجھکو شاہِ خوباں کیوں کہا میں نے
نہ کی پھر بات ہی مجھ سے غرورِ شہریاری میں

ٹھہرا ہے سیلِ گریہ ہی جو عکسِ یار کی طالب
صفائی کی ہر صورت غیر ممکن بیقراری میں

غریب آزار کو فرعون اہلِ دل سمجھتے ہیں
وہ تختِ عاج پر نکلے کہ سونے کی عماری میں

ہے اس سفاک کا بھی سامنا محشر میں [illegible]
خدا جانے کہوں کیا عالمِ بے اختیاری میں

10 — 26

ابھی تک بحثِ امکان و مکاں جاری ہے عالم میں
فنا اک دم میں ہو سارا جہاں موجود اک دم میں
یعنی فیضانِ وجود ہر آن میں نہ ہوتا رہے تو عالم فنا ہو جائے آفتاب کی شعاعوں

جوانان چمن اترا نہ جائیں حسن پر اپنے
جہاں کی بے ثباتی آئینہ ہے دست شبنم میں
مری آنکھوں کے آگے تو نہ کر خوں ای اجل انکا
چھپا رکھی تھی میں نے آرزوئیں جان پر غم میں
کرونگی کسی سے منت سب ممنون منت ہوں
جہاں ڈوبا ہوا ہے چشمہ احسان حاتم میں
سلیماں جہاں سمجھوں نہ کیوں اہل مروت کو
تبسم ہے لب رنگیں پہ جیسے نقش خاتم میں
حیا دی ہے خدا نے آنکھ میں اہل سعادت کی
نگہ ہے پرورش پائے ہوئے دامان مریم میں
فریب اہل دنیا سے نہیں مرد خدا ڈرتے
حقیقت حیلہ روباہ کی کیا چشم ضیغم میں
مجھے اس عالم افتادگی میں رشک آتا ہے
کہاں سے آگئی یہ طاقت پرواز شبنم میں
عجب ہے بزم مے میں سیر کرنا سارے عالم کی
کوئی قطرہ شراب عشق کا تھا ساغر جم میں

بقیہ | کا سلسلہ ذرا موقوف ہو تو دنیا تاریک ہو جائیگی کل یوم ہو فی شان ۱۲

ملی شاہ و گدا کی خاک تو ہوتی تھیں یہ باتیں
ملاپ آخر ہوا اک عمر کے بعد آپ میں ہم میں

٢٠ — مفاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل — ١٢٧

گمراہ کیا نفس نے دنیائے دنی میں
رہزن کا مرا ساتھ ہی امن بیوطنی میں

تنہا نہ ملا گوشہ مرقد بھی کسی کو
سنتی ہیں کہ کشتی ہوئی درویش غنی میں

مقتل میں مجھے یوں جگر و دل نظر آئے
یہ تیر[۱] کے پیکاں ہیں وہ برچھی کی انی میں

سینہ میں ٹھہرا نہیں دم تا بہ دم مرگ
کیا یہ پس و پیش ہی امر شدنی میں

آئی تو کسی طرح سے اس بت کو تبسم
بجلی کی چمک دیکھ لو ہیرے کی کنی میں

جس نخل کو یہ سیل فنا دیتی ہے پانی
مصروف اوسی نخل کی ہے بیخ کنی میں

لازم ہے کہ دامان و گریباں میں ہو چاک
ہے موسم گل لطف ہے گل پیرہنی میں

کچھ پیر مغاں سے تجھے نسبت نہیں زاہد
ہوتا ہے بڑا فرق کریم اور دنی میں

رنگت تری لب کی ہے نزاکت نہیں لیکن
یاقوت بدخشاں نہ عقیق یمنی میں

بجلی سی چمک جاتی ہے پھرتا ہے جو توسن
شاید دل بیتاب ہے برچھی کی انی میں

اک بات کی جس سے وہ ہوا کشتہ حسرت
کیا زہر گھلا ہے تری شیریں سخنی میں

قبلہ سے جو نور کی اٹھی ہیں گھٹائیں
ڈوبا ہے چمن رنگ عقیق یمنی میں

کہنی میں نہو نفس تو کر قتل کی تدبیر
کیا فرق ہے گردن کش و گردن زدنی میں

[۱] تیر اور برچھی مژہ اور نگاہ کے معنی میں ہے ۔ ١٢

ہے نفس کی اصلاح تو بس نفس کشی میں
ہر گز سخن تلخ میں دیکھی نہیں یہ بات
ساتھ آئی ہے کچھ گرد کدورت جو وطن سے
چلتے ہیں وہ اب راہ ہماری پہ قلم کے
مل جائیگا محشر میں دل اس عربدہ جو کا
کافر ہوں کسی بات کا مجھکو جو یقیں ہو
کرتے ہیں وہ ظلم اور پشیماں نہیں ہوتے

۱۲۸

اندیشہ ہے رہزن کا بھی ہر راہ گذر میں
آنکھیں مری یوں محو تماشا ہیں دونوں
کہتے ہیں غلط تیر لگایا نہیں تو نے
افسانہ رہا محفل عشرت کا ہمیشہ
پر خوف یہ منزل ہے سبکبار گذر جا
ہیں شہر خموشاں میں کسی جا کی پکارو
دیتا ہے وہ نعمت تو اٹھائی نہیں اٹھتی
گر اہل جہاں داغ اٹھائی نہیں جلتے
بچپن سے جوانی ہے جوانی سے بڑھاپا

کچھ دل کی درستی ہے تو بس دل شکنی میں
کچھ کام نکلتا ہے تو شیریں سخنی میں
پروا مجھے مرقد کی نہیں بے وطنی میں
جو شہرۂ آفاق تھے شمشیر زنی میں
عادت یہ ہمیشہ کی ہے اس ناشمنی میں
ملتا ہے مزہ آپ کو پیماں شکنی میں
سمجھے ہیں کہ آواز نہیں دل شکنی میں

۳۱

اس طرح سے غافل کوئی سوتا ہے سفر میں
وہ داغ تھے گویا پر طاؤس نظر میں
میں نے چھپایا ترے ناوک کو جگر میں
وہ شمع کا جلوہ نہ رہا رات ہی بھر میں
برسوں سے یہ آتی ہے صدا راہ گذر میں
در ہے مگر آواز نہیں حلقۂ در میں
پھولوں سے لپک آ گئی شاخ گل تر میں
پھر کس لیے پیدا ہوئی اس دور قمر میں
ہے خاتمہ عمر اسی شام و سحر میں

کیوں تائیہ یار آنکھوں سے اپنی نہ لگاؤں | [illegible] ہو تیر باندھ کے جبریل کے پر میں

مست مئے عرفاں کو کسی طرح سنبھالے | ایسا بھی ہے ہشیار کوئی آل حجر میں

اس راہ میں دم نکلے تو کیا دور سے کیا کام | کرنا مجھے دفن اسی گرد سفر میں

کس طرح بھنا دل کے گلے میں اتر آئے | نغمے تھے نہاں پردہ برگ گل تر میں

یہ شیشہ گری ابر نے کی ہے کہ ہوا نے | خلخال بلوریں ہے ہر اک ساق شجر میں

مطلوب اگر ہو دل مردہ کو جلانا | ہے [illegible] عیسیٰ نفس باد سحر میں

حسرت ہے کبھی عمر گذشتہ کو کریں یاد | مہلت ہمیں اتنی نہ ملی آٹھ پہر میں

گھیرے ہوئے ہے خلق کو یوں نعمت خالق | جس طرح سے جوہر کا ہو لمعہ سنگ حجر میں

نکلا نہ کسی سوزن مژگاں سے مرا کام | ہر سو دل ہر [illegible] رہی اک پھانس جگر میں

کہتی ہے یہ دانتوں کی چمک وقت تبسم | ڈورے کی جگہ برق ہے اس عقد گہر میں

ہے اس کی ادا قاتل عالم دم رفتار | تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

اس بزم میں ہے نظم جنہیں لطف نہ آئے
حافظ کی غزل میں نہ رباعی عمر میں

۱۵ ——— ۱۲۹

مفتعلن مفاعلن (۲) بار

سنگ جفا کا غم نہیں | دست طلب کا ڈر نہیں

اپنا ہے اس پہ آشیاں | نخل جو بار ور نہیں

سنتے ہو اہلِ قافلہ میں کوئی راہبر نہیں
دیکھ رہا ہوں تم میں سے ایک بھی راہ پر نہیں

موت کا گھر ہے آسماں اس سے کہیں مفر
نکلیں تو کوئی در نہیں بھاگیں تو رہگذر نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا نام نہ تھا نشان نہ تھا
آخر کار یہ ہوا آہ تو ہے جگر نہیں

صبحِ ازل سے تا ابد قصہ نہ ہوگا یہ تمام
جورِ فلک کی داستاں ایسی بھی مختصر نہیں

برگِ خزاں رسیدہ ہوں چھیڑ نہ مجھکو اے نسیم
ذوقِ فغاں کا ہے مجھے شکوہ ابرِ تر نہیں

منکرِ حشر ہے کدھر دیکھے تو آنکھ کھول کر
حشر کی جو خبر نہ تھی ایسی [illegible]

شبنم و گل کو دیکھکر وجد نہ آئے کسطرح
خندۂ بے سبب نہیں گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور تاجوروں سے ہے سوا
طرفِ کلہ میں دے شکن اس کو یہ دردِ سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در تو نے بنا کئے تو کیا

حیف ہے خانماں خراب دل میں کسی کے گھر نہیں

نالہ کشی رقیب سے میری طرح محال ہے
دل نہیں حوصلہ نہیں زہرہ نہیں جگر نہیں

شاطر پیر آسماں واہ ری تیری دستبرد
خسرو و کیقباد کی تیغ نہیں کمر نہیں

شان کریم کی یہ ہے اس سے ہو بیشتر عطا
لطف عطا کا کیا ہو جب اس سے ہو بیشتر نہیں

لاکھ وہ بے رخی کرے لاکھ وہ کج روی کرے
کچھ تو ملال اس کا ہو دل کو مرے مگر نہیں

سن کے برا نہ مانیے سچ کو نہ جھوٹ جانیے
ذکر ہے کچھ گلہ نہیں بات ہے نیشتر نہیں

حرف واو

۱۲ مفاعیلن چار بار

ندامت ہے بنا کر اس چمن میں آشیاں مجھ کو
ملا ہمدم یہاں کوئی نہ کوئی ہمزباں مجھ کو

دکھائے جا روانی تو سر آب عمر رواں مجھ کو

ہلال برق سے رکھ ہم رکاب ہم عناں مجھ کو
بنایا ناتوانی نے سلیمان زماں مجھ کو
اڑا کر لے چلے موج نسیم بوستاں مجھ کو
وم صبح ازل سے میں نوا سنجوں میں ہوں شامل
مثل سدرہ نے انداز فغاں مجھ کو
کیا معلوم کب سوئی وہ کب جاگے
تو اس لئے کھینی پڑی پھر داستاں مجھ کو
یم زار کو سپینکا
میں حقی بانگ رائے کارواں مجھ کو
کہ ہو کر بھی نہ جائے گی
ے لب ساحل سے یہ ریگ رواں مجھ کو
تیرے واسطے میں نے
اندہ ملال منزلوں میں آسماں مجھ کو
بلاوے ہوں وہ پروانہ
آگ دل میں جب نظر آیا دھواں مجھ کو
آیا ناتواں ہو کر
سے حسرت دیدار لے آئی کہاں مجھ کو

وہ جس عالم میں جا پہونچا وہاں میں کس طرح جاؤں
ہوا دل آپ سے باہر پہنا کر بیڑیاں مجھ کو
غبار راہ سے تکلم یہ آواز آتی ہے
گئی اے عمر رفتہ تو کدھر پھینکا کہاں مجھکو

12
نہیں پروا جو ظالم نے مٹایا میری تربت کو
لحد میں جائے گر ظاہر کروں دل کی کدورت کو
کسی نے شعلہ ساں آنچل میں باندھا ہو شرارت کو
گرہ میں باندھے ہے اب شکل اخگر داغ حسرت کو
ترے ممنون ہم سب رند اے باد بہاری ہیں
اڑا لاتی ہے میخانہ پہ تو باران رحمت کو
یہ وہ دن ہیں کہ اب آنکھوں کو اپنی ڈھونڈتے ہیں ہم
گئے وہ دن کہ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اسکی صورت کو
نکل جاتا ہے نام اک شعر اگر اچھا نکل آئے
یہ دو مصرع تو گویا پر لگا دیتے ہیں شہرت کو
ہوا سالک کو حاصل کیا دو صد زانو تامل سے
کہ دیکھا گام اول میں دو صد آئینہ حیرت کو

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں مروت کو

حسینوں کو کیا گرویدہ اس نے آئینہ بن کر
دل وارفتہ نے جس طاق پر رکھا تھا حیرت کو

کہیں الزام محشر میں نہ ہو اس پر تغافل کا
میرے لاشہ پہ لے آئے کوئی اس بے مروت کو

پلک جھپکاتے نرگس کو نہ دیکھا باغ میں ہم نے
جو آنکھیں ہوں تو بس دیکھا کرے صانع کی قدرت کو

بیاباں ہو ابھی زنداں میں پیدا ہے دیوانہ
جھٹک دوں میں اگر دامن سے اپنے گرد کلفت کو

نہ تھی اے نظم تدبیر اور کچھ دل کے بہلنے کی
گریباں سے الجھتا تھا

۱۳۲ عجب شوریست از حرف دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندہ سرشار بر رویم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو

وفور مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
ہمہ شاعر فاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
بہ بیں گر گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بر شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بر بیتابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد
کہ خود تیغش بلرزد چوں پر پروانہ در پہلو
تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلف او
نمایاں استخوانہا گشتہ مثل شانہ در پہلو
بشر در انقلاب دہر گوئی در غلطان است
بہر پہلو کہ غلطد دار و آب و دانہ در پہلو
ہمانا چارۂ داغ دل از مرہم نمی آید
کہ دارم پنبہ بر پہلو و آتش خانہ در پہلو
دلم محو طلسمات جہاں من طالب صانع

ہوائے کعبہ در سر دارم و بت خانہ در پہلو
خوشا وقت قدح خواری کہ گردش می کند باہم
بگردش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو
چہ طور راز [illegible] بہ تنہا کہ بنوشتم یاد آخر
کہ ہر یک نقطہ دارد معنی بیگانہ در پہلو
چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر
کہ دل سوزد لبش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

۱۳۴
عبث ہے ناز استغنا پہ کل کی کیا خبر کیا ہو
خدا معلوم یہ ساماں کیا ہو جائے سر کیا ہو
یہ آہ بے اثر کیا [illegible] نخل بے ثمر کیا ہو
[illegible] یا رب تو دل کیا ہو جگر کیا ہو
جہاں انسان کھو جا[illegible] محفل میں
رسائی اس کی کس طرح ہو دخل کیونکر ہو گذر کیا ہو
نہ پوچھو لاگا یہ بھی جام ہے زہر یا امرت
تمہارے ہاتھ سے اندیشہ نفع و ضرر کیا ہو
مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں

یہ سچ ہے نازنیں ہو خوبصورت ہو مگر کیا ہو
شگوفے دیکھ کر مٹھی میں زر کو مسکراتے ہیں
کہ جب عمر اس قدر کوتاہ رکھتے ہیں تو زر کیا ہو
رہا کرتی ہے یہ حیرت مجھے زہد ریائی پر
خدا سے جو نہیں ڈرتا اوسے بندہ کا ڈر کیا ہو
کہا میں نے کہ نظم مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اوس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو
کہا میں نے کہ ہے سوز جگر اور اف نہیں کرتا
کہا اس کی اجازت ہی نہیں پھر نوحہ گر کیا ہو
کہا میں نے کہ دے اوس کو اجازت آہ کرنے کی
کہا اوس نے بھڑک اٹھے اگر سوز جگر کیا ہو
کہا میں نے کہ آنسو آنکھ کا لیکن نہیں تھمتا
کہا آنکھیں کوئی تلووں سے مل ڈالے اگر کیا ہو
کہا میں نے قدم بھر پر ہے وہ صورت دکھاؤ
کیا منھ پھیر کر اتنا کسی کو دردسر کیا ہو
کہا میں نے اثر مطلق نہیں کیا سنگدل ہے تو
کہا جب دل ہو پتھر کا تو پتھر پر اثر کیا ہو

کہا میں نے جو مر جائے تو کیا ہو سوچ لو دل میں
کہا نا عاقبت اندیش نے کچھ سوچ کر کیا ہو
کہا میں نے خبر بھی ہے کہ دی جان اوس نے گھٹ گھٹ کر۔
کہا مر جائے جیکی سر پہ تو پھر مجھ کو خبر کیا ہو

١٢٢ مجھی کو کہہ رہے ہو سب کہ سرگرم فغاں کیوں ہو ١٤
کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم نامہرباں کیوں ہو
نہ کھینچ اے چارہ گر پیکان قاتل میرے سینے سے
ملیں یوں دل سے دل باہم تو کوئی درمیاں کیوں ہو
سرائے دہر میں ٹھہرے تو پھر شکوہ شکایت کیا
جسے خون جگر کھانا ہو وہ مہماں کیوں ہو
یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو
ملے گی داد کیا محشر میں ہم کو اس ستمگر سے
نہیں ہونا ہوا کچھ تو پھر شور و فغاں کیوں ہو
قیامت آج ہی آ جائے صور حشر پھنک جائے
شب غم میں سحر کیوں صبح کی نوبت اذاں کیوں ہو

جب اپنی خو یہ ٹھہرے منہ میں جو آئے سو کہہ جا
تو پھر کہنا کسی کا طبع نازک پر گراں کیوں ہو

اشارہ میں گلِ نرگس نے پوچھا اسکی آنکھوں سے
فدا میں تم پہ تم بیمار کیوں ہو ناتواں کیوں ہو

نہ دیوانوں کے منہ لگ تو نہ ایسی گت بنے ناصح
اڑیں دامن کے کیوں پرزے گریباں دھجیاں کیوں ہو

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا زمرِ خوباں میں
اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

اسے بے مانگے ہی دینے کی عادت تو نے ڈالی ہے
تو شرمندہ کسی کا پھر گدائے آستاں کیوں ہو

سمجھ لے دہر کو جاتا ہوا سیلاب ہے ورنہ
حباب آسماں کے ساتھ موج کہکشاں کیوں ہو

خبر لو ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے چہرہ کا
تلون گر نہ ہو تو تیوریوں میں موج پیچاں کیوں ہو

تڑپنا نیم بسمل ہو کے حیدر تھا مقدر میں
رگے میں جب وہی مجھ سے تو پھر خنجر رواں کیوں ہو

ملے ہیں نقش جو ہم بوریا نشینوں کو
وہ دست یاب نہیں شاہوں کے نگینوں کو
کیا ہے صاف دلوں کی جو دوربینوں کو
تو ساتھ پردوں میں دیکھا کئے حسینوں کو
ہزار طرح سے پہلو تہی وہ کرتا ہے
کہیں جگہ نہیں ملتی ہے ہم نشینوں کو
گلہ بھی اس کے تغافل کا ہو نہیں سکتا
غرور و ناز ہی زیبا ہے نازنینوں کو
چمن کی سیر مبارک ہو تجھ کو اے نرگس
کسے یہ تاب کہ دیکھا کرے حسینوں کو
جہاں جہاں مری فکر بلند کا ہے عمل
نہ آسمان سے بدلوں میں ان زمینوں کو
ہوش رہی نہیں دولت کی خاکساری کیا
کہ اس زمین نے سرکا دیا دفینوں کو
بتا دیا ہے ہمیں ساقی ازل نے یہی
کہ اپنے رنگ میں تو کھینچ ہم نشینوں کو
نہ پوچھ باد صبا موسم خزاں کا ملال

بسر کیا ہے بری طرح ان مہینوں کو
چھپائیں چاند کو کیا خاک ڈال کر اے نظم
بھلا میں دل کی کدورت سے مہ جبینوں کو

۱۸ ۱۳۶

کیا شراب نے رنگین آبگینوں کو
تو رنگ دیا ترے ساعد نے آستینوں کو
ہوس مقابلہ کی اوس سے تھی حسینوں کو
صفیں الٹ گئیں اُلٹا جو آستینوں کو
خدا کرے نہ کسی کو کسی کا دست نگر
کہ بار بار چڑھاتے ہیں آستینوں کو
قبائے یار سے کس طرح دیتے ہم تشبیہ
قبائے گل میں نہ دیکھا تھا آستینوں کو
جہاں سے اہل ہوس ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
ہزار بار چڑھایا ہے آستینوں کو
کوئی غبار کے پردے میں ہو نہ دامن گیر
الٹ لے آئینہ پرداز آستینوں کو
نشاں بن گئے ہیں نازکی سے ہاتھوں میں

قبا جو پہنی ہے چنوا کے آستینوں کو

غرض کسی نہ کسی طرح چٹکیاں لینا
کوئی یہ جانے کہ چنتے ہیں آستینوں کو

بہار دیدۂ خونبار کا ہوں میں مفتوں
کہ شاخ گل سے ہے تشبیہ آستینوں کو

نہ رکھا تار گریباں میں نہ دامن میں
الٹ کے پنجۂ وحشت نے آستینوں کو

رہا جنوں میں بھی مجھ کو لحاظ پردہ دری
دیا ہے چاک گریباں کا آستینوں کو

ہے اوج فقر یہ زاہد جہاں سے کھینچ کے ہاتھ
بنا لیا پر پرواز آستینوں کو

جو بزم میں ہو تماشائے رقص اوسے منظور
نکالے جامۂ فانوس آستینوں کو

کنارہ جو نظر آتا ہے پنجۂ مرجاں
چنا ہے مل کے حنا اس نے آستینوں کو

نظیر یہی ہے سبب کسر شان ہے چین جبیں
شکن ہے جیسے ہو کوتاہی آستینوں کو

بنایا اشکوں نے دامن کو دامن دریا
بجا ہے موج سے تشبیہ آستینوں کو

کمال حسن ہے دست ہوس کی کوتاہی
شکن نہ زیب دے کس طرح آستینوں کو

ہر ایک شعر میں چیدہ ہیں مصرع اے حیدر
چنا ہے شاہد مضموں کی آستینوں کو

١٤٧ —— فاعیل فاعلات مفاعیل فاعلات —— ١٥

اتنا تو میں ضرور کہوں گا خفا نہ ہو
بے مثل حسن میں ہو اگر بے وفا نہ ہو

آئینہ کہہ رہا ہے کہ ہو محو ناز تو
سمجھا رہی ہے شرم کوئی دیکھتا نہ ہو

ہستی فقط تصور ہستی کا نام ہے
زندہ نہیں ہے وہ جسے یاد خدا نہ ہو

وہ آدمی نہیں ہے جو خالی ہو درد سے
اس دل کو دل نہ جانیے جو مبتلا نہ ہو

منکر ہر ایک شئے سے اسی کا ظہور ہے
اس کا علاج کیا جو تجھے سوجھتا نہ ہو

وہ بھی ہیں لوگ حشر میں جنکو ہے شوق دید
ڈرتا ہوں میں خدا سے کہیں سامنا نہ ہو

اغیار تو ہوں ساقی مہوش شریک دور
پھرتے رہیں کھڑے تو ہماری صلا نہ ہو

بھولا ہوا ہے حیف تعہد الست کو
ممکن ہے یہ کہ مرکے بھی وعدہ وفا نہ ہو

ہے زیست وہ پہاڑ جو کاٹے نہ کٹ سکے
اس راہ میں اگر فرس بادپا نہ ہو

دریائے بے کنار ہوا اور اک میں ماہ ولا
خنجر دیدۂ احباب کوئی آشنا نہ ہو

اس دشت سے گزر تو سبکبار ہی گزر
اس طرح چاہیے کہ کہیں نقشِ پا نہ ہو

پھیلاؤ آشنا پا دل نہ دنیا کو دیکھکر
گھر جس کو اپنا سمجھے ہو مہماں سرا نہ ہو

کیا ہونگے اوسپہ پھولکے وہ گلبیانیں
کیا چاندنی کا لطف جو وہ مہ لقا نہ ہو

مشکل پسند میری طبیعت ہے شعر میں
جاتا ہوں اس طرف کہ جدھر راستا نہ ہو

حیراں ہوں میں دعا ہے کہ یہ کوسنا ہے نظم
کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کے تیرا برا نہ ہو

۴۲۶ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

مجھ کو سمجھو یادگارِ رفتگانِ لکھنؤ
ہوں قدِ آدم غبارِ کاروانِ لکھنؤ

خونِ حسرت کہہ رہا ہے داستانِ لکھنؤ
رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنؤ

گوشِ عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے
بلبلِ خونیں نوائے بوستانِ لکھنؤ

میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے
میرے ہر نالہ میں ہے طرزِ فغانِ لکھنؤ

ڈھونڈھتا ہے اب کسے لے کر چراغِ آفتاب
کیوں مٹایا اے فلک تونے نشانِ لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید
ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ

اب نظر آتا نہیں وہ مجمعِ اہلِ کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ

پہلے تھا اہلِ زباں کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیئے تھی تیغ اردو کو فسانِ لکھنؤ

مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو تا توں میں ہوتا نوحہ خوانِ لکھنؤ

یہ غبارِ ناتواں خاکسترِ پروانہ ہے
خاندان اپنا تھا شمعِ دودمانِ لکھنؤ

چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفلِ رضیع
سجدہ کرتے تھے اُسے گردن کشانِ لکھنؤ

عہدِ پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں ہے نے چوسی ہے زبانِ لکھنؤ

گلشنِ فردوس پر کیا ناز ہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنؤ

بوئے اُنس آتی ہے حیدر خاک ٹیا برج سے

مجمع ہیں اک جلاوطن آوارگان لکھنؤ

۱۶ ۱۳۹

فغاں از آہ وزاری دل دیوانہ در پہلو
شب مازندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
دل من سوخت ناگاہ پرتوے از شمع رخسارش
فغاں کیں شعلہ افتادہ است بیباکانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندۂ سرشار بر ردیم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو
وفور مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
بہ بیں کز گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم سبت شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بر بے تابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد

که خود تیغش بلرزد چون پر پروانه در پهلو

تنم را زار کرد است آنچنان سودائے زلف او

نمایان استخوان ہا گشته مثل شانه در پهلو

بشر در انقلاب دہر گوئی در غلطان است

بہر پہلو که غلطد دارد آب و دانه در پهلو

ہمانا چاره داغ دل از مرہم نمی آید

که دارم سینه بر پہلو و آتش خانه در پهلو

مثل شد در تناسب چشم و ابرویش چو در عالم

ز راہِ شوق مسجد می کشد میخانه در پهلو

دلم محو طلسمات جہان من طالب صانع

ہوائے کعبه در سر دارم و بتخانه در پهلو

خوشا وقت قدح خواری که گردش میکند باہم

بنزمش ساغر و ہم سبحه صد دانه در پهلو

چه طومار شکایتہا که بنوشتم باو آخر

که ہر یک لفظ دارد معنی بیگانه در پهلو

چو گل با خار مبنی جائے فریاد است اے حیدر

که دل سوزد لبش پر خنده و بیگانه در پهلو

۱۲۹ — **حرف ہ** — ۱۲

کس لیے پھرتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ
کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی
بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ

بعد میرے نہ رہا عشق کی منزل کا نشاں
مٹ گئے راہرو و راہ گذر دونوں ساتھ

اے جنوں دیکھ اسی صحرا میں اکیلا ہوں میں
رہتی جس دشت میں ہر خوف و خطر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر
یا خدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ

اس نے پھیری نگہ ناز یہ معلوم ہوا
کھینچ گیا سینے سے تیر اور جگر دونوں ساتھ

غم کو دی دل نے جگہ دل کو جگہ پہلو نے
ایک گوشے میں کریں گے یہ بسر دونوں ساتھ

اس کو روکوں میں الٰہی کہ سنبھالوں اس کو
کہ تڑپنے لگے دل اور جگر دونوں ساتھ

ناز بڑھتا گیا بڑھتے گئے جوں جوں گیسو
بل کی لینے لگے اب زلف و کمر دونوں ساتھ

تجھ سے مطلب ہے نہیں دنیا و عقبیٰ[1] سے غرض
تو نہیں جب تو اجڑ جائیں یہ گھر دونوں ساتھ

بات سننا کسی چاہنے والے کی کبھی
کان میں پھونک رہے ہیں یہ گہر دونوں ساتھ

ہمدمیاں آہ کی بھی اشک کا سیلاب بھی ہے
دیتے ہیں دل کی خرابی کی خبر دونوں ساتھ

کیا کہوں زہرہ و خورشید کا عالم اے نظم
نکلے خلوت سے جو نہیں وقت سحر دونوں ساتھ

[1] دنیا میں الف مقصورہ ہے بعد ازاں اس کا متحرک کر لینا جائز ہے

۱۴۱ ———— ۱۱

یوں تو نہ تری جسم نہ ہیں زینہار ہاتھ
دینے کے اے کریم مگر ہیں ہزار ہاتھ

انگڑائیوں میں پھیلتے ہیں بار بار ہاتھ
شیشہ کی سمت بڑھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

ڈوبے ہیں ترکِ سعی سے افسوس تو یہ ہے
ساحل تھا ہاتھ بھر پہ لگاتے جو چار ہاتھ

آتی ہے جب نسیم تو کہتی ہے موجِ بحر
یوں آبرو سمیٹ اگر ہوں ہزار ہاتھ

دیے ہیں میرے قتل کے احباب اور میں
خوش ہوں کہ میرے خون سے رنگتے ہیں یار ہاتھ

دامن کشاں چلی ہے بدن سے نکل کے روح
کھنچتے ہیں پھیلتے ہیں جو یوں بار بار ہاتھ

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح
پتھر سے سر کو پھوڑ کے زانو پہ مار ہاتھ

ساقی سنبھالنا کہ ہے لبریز جامِ مے
لغزش ہے میرے پاؤں میں اور رعشہ دار ہاتھ

مطرب سے پوچھ مسئلہ جبر و اختیار
کیا تال سم پہ اٹھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

میں ایسا ہوں علائقِ دنیا کے دام میں
میرا نہ ایک ہاتھ نہ اس کے ہزار ہاتھ

اے نظم وصل میں بھی رہا تو نہ چین سے
دل کو ہوا قرار تو ہے بے قرار ہاتھ

حرف ی

فاعیل فاعلات مفاعیل فاعلات

۱۴۲ ———— ۲۰

جھگڑا پڑا ہوا ہے نکلنے میں جان کے
کچھ حوصلے ابھی ہیں اسی امتحان کے

آئی بہار اور خفقانی جہاں کے
جنگل میں پیرہن کے گئے خاک چھان کے

لایعقلانہ طرز ہیں سارے جہان کے
کیسی شرارے دور میں ہیں آسمان کے

کیا دیر انقلاب میں اب نئے جہان کے
نالے پہنچ گئے ہیں قریب آسمان کے

دکھلا دو منہ ذرا صف محشر میں آن کے
اوڑ جائیں ہوش آج بھی سارے جہان کے

چاہے تو دو جہاں کو ڈبو دے یہ طفل اشک
مشقی ہیں ہیچ سات ورق آسمان کے

حیران ہوں گلہ جو کسی سے کروں تو کیا
جو دل کا حال ہے نہیں قابل بیان کے

پازیب تک پہنچ گئے تو حلقہائے زلف
قلابے مل گئے ہیں زمیں آسمان کے

ہے مغتنم کہ ہجر میں رونا ہی آ گیا
آنکھوں پہ لوں گا میں قدم اس مہمان کے

سمجھا چھوڑا چکا تھا میں دل اسی اٹھا کے ہاتھ
دل ہاتھ دھو کے پیچھے پڑا میری جان کے

گوندا یہ کہہ رہا ہے کہ ہے فوج گل قریب
کہسار تک پہنچ گئے ہاتھی نشان کے

شیریں ہیں تیری گالیاں بھی حرف تلخ
اوصاف کس زبان سے ہوں اس زبان کے

پاتا مجھے نہ عالم اجسام میں کہیں
چھان آئی فکر سات طبق آسمان کے

اب تک میں سن رہا ہوں صدائے الست کو
گویا حجاب قدس یہ پردے ہیں کان کے

احسان سر پہ لے تو کسی بار وقار کا
ٹھہرے اگر تو سایہ میں اونچے مکان کے

آنکھوں کے سامنے سے گیا ہے وہ قافلہ
دیکھے جہاں میں لوگ نہ اس آن بان کے

بہتر ہی تو یہی اے نفس واپسیں نہ آ
کب تک اوٹھاؤں ضعف میں صدمے تکان کے

شوخی میں چشم غول کو سمجھا چراغ بام
مارا پڑا میں دھیان میں تیرے مکان کے

اے دودِ آہ ہو گئی رسوائیوں کی حد
جھنڈی پہ چڑھ گئی ہیں تری ہاتھی نشان کے

اے نظم بزمِ عیش پہ مقتل کا ہے گماں
چھریاں یہ چل رہی ہیں کہ فقرے ادان کے

۱۴۲ —— ۲۱

روکے ہوئے ہے بن کے حصارِ آسماں مجھے
ذوقِ وصال کھینچ کے لایا کہاں مجھے

لے تو چلا ہے توسنِ عمرِ رواں مجھے
اس کی خبر نہیں کہ گرا دے کہاں مجھے

ہوش و خرد ملے مجھے تاب و تواں مجھے
اس کے عوض اٹھانا ہے بارِ گراں مجھے

ہوں قلزمِ فنا میں سہارے پہ سانس کے
دیکھے اے حباب جب ملا بادباں مجھے

جب بے کنارہ میں نے کیا سیر کی طرح
یکساں ہے اس چمن کی بہار و خزاں مجھے

کچھ کہہ رہی تھی شہرِ خموشاں کی خامشی
کوئی سنے تو یاد ہے اک داستاں مجھے

جلدی نہ کر تعلقِ دنیا ہے سدِّ راہ
اے موت توڑنا ہے یہ بندِ گراں مجھے

اچھا اگر نہیں شنوائی نہیں سہی
اس کا علاج کیا کہ ہے ذوقِ فغاں مجھے

کہتا ہے اوٹھتے بیٹھتے واماندوں کا غبار
کیوں ٹھوکروں میں لے نہ گیا کارواں مجھے

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا
اک بیخودی تھی ہوش تھا یارب کہاں مجھے

دیکھا شعار اہلِ ورع سمعہ و ریا
آئی پسند صحبتِ دیرِ مغاں مجھے

سن لے یہ کہہ رہا ہے زمانہ شباب کا
وقتِ عزیز میں ہوں نہ کر رائگاں مجھے

بھولا ہوا ہوں عہد کو صبحِ الست کے
پہلا سبق ہوا نہیں اب تک رواں مجھے

ناوک لگا رہا ہے اس انداز سے کوئی / لہرا رہی ہے موجِ تہِ رنگ کماں مجھے
سر میں سفیدی آ گئی پایا نہ پھر بھی ہوش / پچھلے کی چاندنی میں ہے یہ خوابِ گراں مجھے
کچھ کم نہ تھا بہار کا غم اس پہ یہ ستم / رہ رہ کے چھیڑ جاتی ہے بادِ خزاں مجھے
آفاتِ دہر سے تھا ہراساں میں کس قدر / دی مرگِ ناگہاں نے نویدِ اماں مجھے
زحمت بغیر خلق میں راحت نہیں نصیب / تنکے چنے ہیں جب تو ملا آشیاں مجھے
خواہش کی پیروی ہے جہنم کا راستا / گلخن میں لے چلی ہوسِ گلستاں مجھے
باہم جو اتحاد ہے پایا نہیں رقیب / اس کے وہاں آئے تو میری ہی زباں مجھے

اے نظم کوہ و دشت میں چکرا رہا ہوں اب
بانگِ جرس ہوں چھوڑ چلا کارواں مجھے

۱۶۳ ۲۲

گذری نسیم باغ کو شاداں کیے ہوئے / رہ جاتے ہیں جہان میں احساں کیے ہوئے
رخ ہے عدم کا عمر گریزاں کیے ہوئے / ہستی کو گردِ جنبشِ داماں کیے ہوئے
تھی صبح ظلمتِ شبِ غم سے ڈری ہوئی / آئی چراغ کو تہِ داماں کیے ہوئے
کیا جلد جا رہا ہے زمانہ نشاط کا / اسپِ عناں گسستہ کو جولاں کیے ہوئے
آیا تھا جوش لالہ و گل کی طرح شباب / جاتا ہے خونِ حسرت و ارماں کیے ہوئے
دشمن سے رنج پہنچے تھے وہ سب بھلا دیے / بھولا نہیں ہوں دوست کے احساں کیے ہوئے
میدانِ بازپرس میں دیوانگانِ عشق / بیٹھے ہیں چاک دفترِ عصیاں کیے ہوئے

دو چار اشک نذر کو لایا ہوں اے کریم
جو خون آرزو میں ہیں غلطاں کیے ہوئے

شبنم اُڑی ہے پھونک کے افسون اہتزاز
تسخیر آفتاب کا ساماں کیے ہوئے

ہم آپ سب شریک تھے بزم الست میں
کچھ یاد بھی ہیں وعدہ و پیماں کیے ہوئے

آزادہ مشربی کا جنہیں کچھ نہیں خیال
یہ لوگ زندگی کو ہے زنداں کیے ہوئے

بیباکیوں پہ فخر ہے سفاکیوں پہ ناز
منہ دیکھتے ہیں تیغ کو عریاں کیے ہوئے

قامت میں [illegible] کے اور قیامت میں فرق کیا
[illegible] ہیں دونوں [illegible] کیے ہوئے

یاران رفتہ سوتے ہو کس کنج تار میں
بزم نشاط عیش کو ویراں کیے ہوئے

راہ طلب میں [illegible] کے ہوا و ہوس سے میل
ہاں سرکشوں کو تابع فرماں کیے ہوئے

[illegible] نے [illegible] شکست نگہ نے دیا جواب
جاتی ہے بیرقی صف [illegible] کیے ہوئے

امید [illegible] کا شکار
رنگ پریدہ کو چمنستاں کیے ہوئے

ساقی تو یہ مژدہ کہ آئی ہے فصل گل
بدلی میں آفتاب کو پنہاں کیے ہوئے

نکلی چمن [illegible] گل [illegible] مشکلیں ہیں سب
چٹکی کلی کہ عقدے ہیں آساں کیے ہوئے

کیا دامن نسیم میں ہے جانفزا ہوا
سمجھے نہیں چراغ فروزاں کیے ہوئے

موج شمیم [illegible] شگوفگی سے ہے لب
بال پری کا رنگ نمایاں کیے ہوئے

[illegible] لالہ زار خون سے سر کوہکن کا ہے
دامن میں میتوں سے چراغاں کیے ہوئے

اے نظم شاعری نہ سہی ساحری تو ہے
[illegible] اس کا اعتراف سخنداں کیے ہوئے

اوتنا ہی شکر نعمت و راحت میں چاہیے
جتنی شراب محفل عشرت میں چاہیے
اس بات کا خیال محبت میں چاہیے
برگ حنا دو رنگ ہے اس سے ہی پائے مال
میکش ہو رند مست ہو شاہد پرست ہو
نکلا حریم قدس رگ جاں سے متصل
پہلو سے دل نکال کے ہاتھوں پہ اپنے رکھ
خدمت کا عمر بھر کی صلا ہے متاع دہر
اے اضطراب نبض لحد کو تو یوں ہلا
ہستی کے ساتھ روگ میں لاکھوں لگے ہوئے
حسرت بھی امید بھی آرزو بھی
اہل وطن نہیں سہی یاد وطن سہی
آنکھوں میں پڑ گئی ہے یہ خاک رہگذر کی
اپنی ہی جب نظر میں سماتے نہیں ہیں ہم
احباب پر نہ لاش اٹھانے کا بار ہو
طعنے دئے تو گالیاں دینے میں شرم کیا

جتنا کہ صبر رنج و مصیبت میں چاہیے
اوتنا ہی خون دل غم فرقت میں چاہیے
یعنی جو چاہیے تو حقیقت میں چاہیے
بس ایک رنگ معنی و صورت میں چاہیے
ہاں سمعہ و ریا نہ عبادت میں چاہیے
ایسی طناب پردۂ قدرت میں چاہیے
ایسا حضور قلب عبادت میں چاہیے
کیا دو گے گز کفن مجھے خلعت میں چاہیے
کچھ فرق گاہوارہ و تربت میں چاہیے
جو چاہیے نہیں وہ اس آفت میں چاہیے
مونس کوئی تو عالم وحشت میں چاہیے
کوئی تو ساتھ وادی غربت میں چاہیے
سرمہ ضرور دیدۂ عبرت میں چاہیے
اب کون سی ہے بات جو ذلت میں چاہیے
میری لحد بھی گوشۂ عزلت میں چاہیے
کچھ تو بھلا نمک بھی جراحت میں چاہیے

یوسف اگرچہ دل ہے مرے دو نگاہ کے ہیں
تکرار اور آپ سے قیمت میں چاہیے

منزل جو ہے بہار تو اے نظم غم نہ کر
تیزی قدم کی قطع مسافت میں چاہیے

۱۴۵ — ۱۰

پہلو میں دل ہے آرزوئے یار کے لئے
آنکھیں ملی ہیں حسرت دیدار کے لئے

طاعت پہ تجھ کو ناز ہے رحمت پہ مجھ کو ناز
زاہد یہ حصن حصیں ہے بیکار کے لئے

سب موئے تن کھڑے ہیں قیامت کے خوف سے
شاید نہال بال گنہگار کے لئے

کانٹوں نے پیرہن کو تبرک بنا لیا
ایک ایک تار لے لیا دستار کے لئے

اب کے عجب نہیں نئے بوٹے بہار سے
اوتریں مسیح نرگس بیمار کے لئے

دیکھا نگاہ بھر کے جو آنکھوں نے یار کو
دو جام بھر کے شربت دیدار کے لئے

لالچ ہے اس دو زر کا بری طرح کاسہ
دیتے ہیں جان شربت دینار کے لئے

پہلو میں ان دنوں ہے غم و یاس کا ہجوم
دل کے لئے جگہ ہے نہ دلدار کے لئے

یاد آتی ہے ہوا تری کوچہ کی خلد میں
دل لوٹتا ہے سایہ دیوار کے لئے

حیدر کو سلسلہ تھا نہ ان گیسوؤں سے کچھ
لیکن اولجھ پڑے ہیں وہ بیکار کے لئے

۱۴۶ — ۱۳

اعمال کے سبب سے گراں بار ہو گئے
جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے

میکش کے حق میں زہر ہے تمیز نیک و بد
رحمت خدا کی ان کو جو ہشیار ہو گئے

بسمل دل و جگر کو نہ دیکھا تھا اس طرح
نالے تو آج کھنچتے ہی تلوار ہو گئے

قہر و عتاب کی بھی نگاہیں تھیں دلنشیں
پیوست تیر تا بہ سوفار ہو گئے

اس رہ گذر میں دام تماشا ہر گام تھا
آزاد بھی ہوئے کہ گرفتار ہو گئے

بجلی کی طرح کرتے ہیں راہ صراط طے
اس بار پہ تڑپ کے ہم اوس پار ہو گئے

دانتوں کے ساتھ دیکھے ہیں تارے کبھی ٹوٹے
جو دن تھے زندگی کے شب تار ہو گئے

مومن بھٹکتے رہ گئے بتخانے میں سبحے
کافر اسیر حلقۂ زنار ہو گئے

عبرت سے دیکھ گور غریباں کے ڈھیر کو
کتنے ہی قصر تن تھے جو مسمار ہو گئے

ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ
ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے

مرنے کی آرزو ہی شب غم میں رہ گئی
حیلے جو موت کے تھے وہ بیکار ہو گئے

مرکز کی طرح جب کوئی ثابت قدم رہا
چکر نصیب کے خط پرکار ہو گئے

بدخوابیوں میں نظم شب غم کٹ گئی
غافل کبھی رہے کبھی ہشیار ہو گئے

۴۷

آخر ہوا شباب وہ صحبت نہیں رہی
لو صبح ہو گئی شب عشرت نہیں رہی

پچھلے کی چاندنی میں یہ سر کے سفید بال
جاڑوں کی دھوپ میں وہ حرارت نہیں رہی

سیماب کشتہ ہو گیا کافور شیب سے
بے چین دل وہ شوخ طبیعت نہیں رہی

سکتہ میں بھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

دلکو سنبھالی رہتی تھی پہلے ہمیں اور اب
خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی

مانند ابر گو کہ سراپا بخار ہیں
مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی

تلووں کو شوق خار مغیلاں نہیں رہا
سر میں ہوائے وادی وحشت نہیں رہی

وہ انتظار وصل کی شب کا گذر گیا
وہ بیقراری شب فرقت نہیں رہی

ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر
مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی

ہی کچھ دنوں کا ذکر کہ جینے کی تھی بہار
لیکن اب اس حسن میں طراوت نہیں رہی

ہی کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی زیست
لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی

ہی کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پہ آب و تاب
لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی

گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا
باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی

اب یہ فروتنی یہ تواضع یہ انکسار
وہ نخوتیں وہ شان وہ شوکت نہیں رہی

لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا
جام شراب ناب پہ رغبت نہیں رہی

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا
باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

بالیں پہ آ کے ناز سے کہتی ہے یہ اجل
کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی

بولی یہ روح قالب خاکی کو چھوڑ کر
دامن پہ گرد وادی غربت نہیں رہی

ان ابروؤں سے راہ حقیقت ملی مجھے
اب دو کمان کی مسافت نہیں رہی

خلوت جو چاہتا ہے تو حیدر خودی کو چھوڑ
خلوت میں ما و من ہو تو خلوت نہیں رہی

۱۴۸

میں دیکھتا ہی رہ گیا وہ چال چل گئے
پہلو سے دل نکال کے تلووں سے مل گئے

حسرت سے دیکھنے پہ وہ کیسا بدل گئے
آخر نہ قتل کر کے بھی تیوری سے بل گئے

ناوک بھی تیری کرتے ہیں بے اعتنائیاں
آئے اِدھر سے اور اُدھر سے نکل گئے

یکساں ہے اب نشیب و فراز جہاں ہمیں
جاتا رہا شباب تو سانچے میں ڈھل گئے

منزل کا شوق اپنے لئے خضر راہ تھا
تھک تھک کے لاکھ بار گرے پھر سنبھل گئے

سیل فنا میں دونوں کی دونوں تھے بے ثبات
آ کر حباب چشم خضر سے ٹوپی بدل گئے

سید اصلاح برگ درختان سبز سے
آئے یہاں سب اور کف افسوس مل گئے

ہے کارساز گریہ اضطراب برق
تڑپا جو دل تو آنکھ سے دریا ابل گئے

حیران ہوں کہ ڈھونڈ کے لاؤں کہاں سے
جو ولولے شباب کے دل سے نکل گئے

عالم کو پھر سرا نہ کہیں ہم تو کیا کہیں
آتا ہے یہ بھی کوئی کہ آج آئے کل گئے

ہستی میں مہر و ماہ کی جلوہ فروشیاں
کھوٹے درم بھی عالم فانی میں چل گئے

قاروں تو سر پہ گنج گراں مایہ لے گیا
ایسے بھی لوگ گذرے جو سر کے بھل گئے

بے دیکھے آ گیا ارنی گو کو غش یہ غش
آئے وہ اور آنکھ بچا کر نکل گئے

ہم دل جلوں کے حال کا پروانہ ہے گواہ
پہنچے قریب شمع تو ہو کے جل گئے

نادان ہیں جنکو فانی کی غرض ہے
مٹی کا مل گیا جو کھلونا بہل گئے

تماشہ بھی شب کو بزم میں زندگی تھا شریک
گیا ٹوپیوں کا ذکر عمامے اچھل گئے

میدان امتحان میں گئے کتنے ہی بلہوس
ٹھہرا گیا نہ زد پہ وہ آ کر نکل گئے

کیا خوف کا تیانِ عمل کا بہار میں
ساقی وہ رت بدل گئی پیرے بدل گئے

جب دل پہ رکھ لیا نہ رکیں گے کسی طرح
پھر تو ہمارے سامنے آئے تو ٹل گئے

رہتے تھے جو سدا یہ غم و فرقت سے قفس میں
لے کر لحد میں ساتھ نہ اونچے محل گئے

عمریں جنہوں نے گوشۂ عزلت میں کاٹ دیں
بیٹھے ہی بیٹھے وہ تو بڑی چال چل گئے

کس نے یہ کہہ دیا میرے ماتم میں رو ؟
نرگس کے پھول دستِ نگاریں سے مل گئے

نقل ہے اہلِ دید کا کافر کے زیرِ بام
دیکھی جو اک جھلک تو کلیجے مسل گئے

اے نظمِ عشق اور ہوس بیچ فرق ہے
بیمار میرے ساتھ کے اکثر سنبھل گئے

۴۹ —— ۱۷

دل اس کے سامنے ہی وہ ہی دل کے سامنے
پردہ جو ہٹ گیا تو آنکھ کے اک تل کے سامنے

بیٹھے ہیں ہم حسینوں کی محفل کے سامنے
کوئی تو آئے کاشش دل کے سامنے

ٹھہرا جنازہ گور کی منزل کے سامنے
کشتی بس اب پہنچ گئی ساحل کے سامنے

ہو گی مجھی پہ تیغ لگانے کی ابتدا
پہلے پہل چلا ہوں میں قاتل کے سامنے

اچھے رہے وہ راہِ وفا میں جو مٹ گئے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں منزل کے سامنے

غنچہ کا دل بھی آہ سے خالی نہ تھا مگر
سنتا ہے کون شورِ عنادل کے سامنے

تیغِ نگاہ ایک خریدار سیکڑوں
چھریاں چلیں گی دیکھنا قاتل کے سامنے

ہم خاک ہو کے بھی نہ رکے راہِ شوق میں
آ پہنچے اور بیٹھ گئے منزل کے سامنے

دیکھا رگ سحاب میں بجلی کا اضطراب
اک نبض ناتواں تپش دل کے سامنے

شرم وفا کا پاس ہے رخ کشتگان عشق
تیوری چڑھے پہ ہے نہ خنجر قاتل کے سامنے

قبلے کے رخ گیا ہے لبوں تک پہنچ کے دم
الٹی چلی نہ سانس بھی منزل کے سامنے

کیسی نگاہ یاس نے تصویر کھینچ لی
قاتل کا منہ اتر گیا بسمل کے سامنے

بھولے ہوئے کو یاد دلانے سے فائدہ
کیوں دل کا نام لیتے ہو بیدل کے سامنے

اے ساربان ناقہ سلمی بہوش باش
اڑ اڑ کے خاک آتی ہے محمل کے سامنے

میری نظر اٹھی یہ جو کٹوا دیا مجھے
گستاخیاں بھری ہوئی محفل کے سامنے

ابرو کا حسن دیکھتے ہی چھپ گیا ہلال
ٹھہرا گیا نہ بدر مقابل کے سامنے

اے نظم مجھ سے پوچھ دل قیس کی خبر
دیکھا تھا لوٹتے کسی محمل کے سامنے

۱۵۰

نشہ میں سوجھتی ہے مجھے دور دور کی
خدمت ہی نذر باغ گلشن طیور کی
ہنگامہ وعظ عشوہ گری بے سبب نہیں
ان زاہدان خشک کو حصہ اگر ملا
میدان حشر میں میرے نالوں کے سامنے
تکیہ ہوا پہ تخت سلیماں ہو آ گیا

۲۴

ندی وہ سامنے ہے شراب طہور کی
از بر ہیں عندلیب کو سطریں زبور کی
واعظ ترے خیال میں جنت پناہ ہے حور کی
مٹی ہوئی خراب شراب طہور کی
بیٹھی ہوئی نکلتی ہے آواز صور کی
ملک در روزہ چھا دیے ہیں بال طیور کی

جاؤں گا مدرسہ میں نہ میں خانقاہ سے — رستے وہ سب ہیں پھیر کے راہیں ہیں دور کی
پائی ہے تیری دیکھنے والے نے وہ نگاہ — جھپکی ذرا نہ آنکھ تجلی سے طور کی
او مٹھے اگر تو سیکڑوں فتنے اٹھا کے آپ — بیٹھے اگر کہیں تو شرارت ضرور کی
پڑھنے سے میرے خط کے بھی اوسکو حجاب ہے — آنکھیں کھلی ہوئی ہیں یا بین السطور کی
کشتی مری تباہ ہوئی پانی میں ہے بڑا اس — گرداب غم کی فکر نہ موج سرور کی
سجدہ بھلا بتوں کو میں کرتا محال تھا — تصویر سے کھنچی ہوئی تیری غرور کی
ہمت سے اہل جذب کی قائم ہے آسماں — اس خیمۂ سیہ میں طنابیں ہیں نور کی
ساقی لگا دے کشتی بادہ کنار آب — دریائے غم سے فکر مجھے ہے عبور کی
سردی سے ہم فقیروں نے مرنا کیا قبول — لیکن نہ کھال کھینچ کے پہنی سمور کی
فاقے گذر رہے ہوں جو اک پیر زال پر — طوفان نوح کیوں نہ خبر لے تنور کی
ہو اس کے سامنے بھی مہ بے تاب ہاں وہی — نکلے گی آج لاش دل ناصبور کی
سمجھا ہیں آئینے سے جو ہو ذہن میں شعور کے — بیٹھے ہوئے بنائیے باتیں فتور کی
خوں کر دیا ہے فندق رنگیں نے لعل کو — ساعد نے پھیر دی ہے کلائی بلور کی
گلشن کو دیکھتا ہوں میں نرگس کی آنکھ سے — سنتا ہوں گوش گل سے کہانی طیور کی
مجھ کو یہ آسماں کی دورنگی سے ہے یقیں — دن آ رہے ہیں عیش کے راتیں ہیں ہور کی
میں ملیہ میکدہ کی نظر پر جو چڑھ گیا — چوٹی دکھائی دینے لگی کوہ طور کی
اس سال کربلا کی جو رخصت ملی مجھے — حج کا تو اب نذر کروں گا حضور کی

اے نظم دیکھ لیجیے گا ہم جو کہتے ہیں
پھر اُس سے بات آپ کی اور ضد کی

۱۵۱ ۱۹

دل میں شرارت اوسکے سمائی ہوئی سی ہے
کچھ آگ دشمنوں کی لگائی ہوئی سی ہے

صورت عتاب کی تو بنائی ہوئی سی ہے
او حیلہ جو ہنسی تجھے آئی ہوئی سی ہے

باد صبا یہ چال اوڑائی ہوئی سی ہے
شوخی ادا کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اوڑائی ہوئی سی ہے

میں کس طرح فلک کے ستم کا گلہ کروں
یہ چال تو کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے

شاہان سرفراز کا اتنا تو ہے نشان
کچھ گرد آسمان تک چھائی ہوئی سی ہے

دلکش کچھ اس طرح کی صدائے الست تھی
کانوں میں آج تک جو سمائی ہوئی سی ہے

منزل اوسے سمجھ کے گھر کھو لیتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

پہلے تو اضطراب تھا دل کو اس قدر
بجلی یہ آسماں کی گرائی ہوئی سی ہے

رنگیں ہے میرے قتل سے دامن بھی یار کا
تلوار بھی لہو میں نہائی ہوئی سی ہے

پانی نہ مانگا کشتۂ شمشیر ناز نے
افعی کے زہر میں بجھائی ہوئی سی ہے

آمد ہے ظلمت شب ہجراں کی دن سے آج
تاریکی آفتاب پہ چھائی ہوئی سی ہے

جلسہ تو ہوگا عید میں دور شراب کا
سرخی ابھی سے چہرہ پہ چھائی ہوئی سی ہے

اس بت کی دید کو نظر پاک میں ہے شرط
اور آنکھ آئینہ کی لگی ہوئی سی ہے

نالے اُسی طرف ہیں رواں آہ اُسی طرف
جانِ حزیں فلک کی ستائی ہوئی سی ہے

زلفیں بھی حلقہ حلقہ ہیں کاکل بھی پیچ پیچ
آنکھوں میں وہ یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

فصلِ بہار آگئی اک جام پیتے ہی
ساقی گھٹا کچھ آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سمجھو اسے ہنر ہوئی شاعر کا ہی کلام
جس شعر میں کہ بات بنائی ہوئی سی ہے

آساں ہے نظم ترکِ ملاقات خلق سے
لیکن بری یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

۱۵۲ —— ۱۰

تنہا نہیں ہوں گر دلِ دیوانہ ساتھ ہے
وہ ہرزہ گرد ہوں کہ پریخانہ ساتھ ہے

ہنگامہ اک پری کی سواری کا دیکھنا
کیا دھوم ہے کہ سیکڑوں دیوانہ ساتھ ہے

دل میں ہیں لاکھ طرح کے حیلے بھرے ہوئے
پھر مشورہ کو آئینہ و شانہ ساتھ ہے

روزِ سیہ میں ساتھ کوئی دے تو جانیے
جب تک فروغِ شمع ہے پروانہ ساتھ ہے

دیتا نہیں ہے ساتھ تہی دست کا کوئی
جب تک کہ مے ہے شیشہ میں پیمانہ ساتھ ہے

سیکھا ہوں میکدہ میں طریقِ فروتنی
جبتک کہ سر ہے سجدۂ شکرانہ ساتھ ہے

جو بے بصر ہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دور دور
اور ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ ساتھ ہے

کیا خوف ہو ہمیں زنِ دنیا کے مکر کا
اپنی مدد کو ہمتِ مردانہ ساتھ ہے

غم کی کتاب ہے دلِ صد پارہ کم نہیں
جس بزم میں گئے یہی افسانہ ساتھ ہے

مانندِ گردباد ہوں خانہ بدوش میں
صحرا میں ہوں مگر مرا کاشانہ ساتھ ہے

۱۵۳ — ۱۵

باندھے تھے ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی
کھولے تھے چھیڑ چھیڑ کے بند قبا کبھی

فریاد و آہ سے نہ مرا دل بھرا کبھی
فوراً اٹھا سے درد جو بیٹھا گلا کبھی

تھی ہم سے آپ سے نہ ملاقات کیا کبھی
یوں پھر گئے کہ جیسے نہ تھے آشنا کبھی

عالم کو قتل کیجئے ترچھی نگاہ سے
یہ ہے وہ تیر جو نہیں کرتا خطا کبھی

کعبہ سے بتکدہ میں گیا خیر ہو گئی
زاہد یہاں قبول نہ ہوتی دعا کبھی

اب اشک گرم آتے ہیں ساتھ آہ سرد کے
ایسی تھی برخلاف نہ آب و ہوا کبھی

دیکھا تھا اک نظر کہ چلے سو نگہ کے تیر
کہتا رہا کہ اب سے نہ ہوگی خطا کبھی

تھا اوسکی میری بیچ میں دریا آئینہ
اوس پار اس طرف کی نہ پہنچی صدا کبھی

گرداب میں جب آ گئی کشتی تو سمجھے ہم
ساحل پہ یاد ہی نہیں آیا خدا کبھی

اس بزم میں جلائے ہم شمع کی طرح
نکلا زبان سے نہ برا یا بھلا کبھی

گویا کہ زخم تھا میں دل روزگار کا
رویا کبھی تو حال پہ اپنے ہنسا کبھی

بے وجہ ہو کسی کی برائی میں جو کوئی
اس کا بھی اس جہاں میں نہ ہوگا بھلا کبھی

زانو پہ مارا ہاتھ کہ پتھر سے پھوڑ سر
ٹوٹا نہیں نصیب کا غافل لکھا کبھی

ظلمات میں تو جا کے نکل آئے تھے خضر
کوچہ میں زلف کے نہ ملے گا پتا کبھی

چشمے کبھی بہائے [illegible] کبھی
تیرا قلم عصا تھا کبھی اژدہا کبھی

۱۵۴ — ۷

کیا طرفہ عاریت نفس مستعار ہے
جس کی بقا کا آمد و شد پر مدار ہے

ہر چرخ کوکب ایک نمود شرار ہے
ہستی سے جو کتابہ عدم بے قرار ہے

چھوڑے نہ راستی کا کبھی راستہ بشر
ہونے دے گر عدو و فلک کج مدار ہے

پتھر میں گھر بنایا ہے تو نے جو اے شرار
آخر بنائے عمر بھی کچھ پائدار ہے

ہے یہ صدائے شکست میں جام حباب کی
طرز طلسم یہ نفس مستعار ہے

ہونے کو اب ہے چاک گریباں کہ آہ میں
انداز پر فشانی باد بہار ہے

فکر رسا کی ہیں قدر اندازیاں عجیب
جو طائر خیال ہے اس کا شکار ہے

۵۵ ۱۱

نظروں سے تو نہاں وہ مثال نظر رہے
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح جلوہ گر رہے

ہے آنکھ وہ کہ عیب پہ اپنی نظر رہے
وہ ہے قطرہ اشک ندامت سے تر رہے

دو دن سرائے دہر میں آ کر اتر رہے
کہنے کو سب کہیں گے یہی عمر بھر رہے

کہتی ہے اے صبا یہی آہستگی کی چال
تو چاہتی ہے باغ میں دم بھر ٹھہر رہے

آیا نہ کچھ جواب نہ قاصد پھرا کوئی
خط لے کے جو گئے تھے وہیں جا کے مر رہے

کیسا خیال ضبط نے رسوا کیا مجھے
نوک مژہ پہ اشک کے قطرے ٹھہر رہے

دم بھی روا نہ ہوا گر افشائے راز ہو
بس کاروان آہ مرا ہم سفر رہے

پڑھ لو لکھا ہے صاف خط تیغ یار میں
ہم معرکہ میں عشق کے سینہ سپر رہے

میں نے کبھی پڑھی جو دعائے ہلال بھی
ابرو کسی حسین کے مد نظر رہے

خورشید پر یہ خندہ دنداں نما ہوا | شبنم کے اشک گل پہ جو وقتِ سحر رہے

اے نظم ساتھ نبھ نہ سکا اہل ذوق کا
جب وہ قدم اٹھا کے چلے ہم ٹھہر رہے

۱۵۶ ——— ۱۱

میں ہی رہا نہ اے شبِ عشرت نہ تو رہی | رونے کو لاش پر جو رہی آرزو رہی
وقتِ سحر نہ بزمِ طرب روبرو رہی | اک میں گرفتہ دل رہا اک آرزو رہی
سمجھے گے تم نہ بات نہ مانو گا میں کبھی | میرے تمہارے حشر پہ اب گفتگو رہی
خلوت میں آئینے نے بھی دیکھا ترا جمال | اور بیقرار ہی تو مجھے آرزو رہی
جھگڑا تمام ہو گیا پہلی نگاہ میں | اچھا ہوا کہ جان گئی آبرو رہی
دل میں مرے ہوا و ہوس کی جگہ نہ تھی | ناخواندہ میہماں کی طرح آرزو رہی
حیرت سے اپنی درس خموشی ملا مجھے | طوطی کو آئینے سے اگر گفتگو رہی
عالم میں اے اجل نہ کوئی تھا رفیق ملا | میں تیرے ساتھ اور مرے ساتھ تو رہی
نکلے گی تن سے روح جدا جانے کس طرح | گر وقتِ نزع کشمکش آرزو رہی
بخشش کا حکم ہو گیا رحم اس کو آ گیا | جب تھوڑی دیر لاش مری قبلہ رو رہی

بیگانہ تھی یہ آمد و رفتِ نفس بھی نظم
ہر ایک ذی حیات کو کچھ جستجو رہی

۱۵۷ ——— مفعول فاعلاتن دوبار ——— ۱۵

خاموش ہیں فغاں سے لب آشنا نہیں ہے
اوس کارواں میں ہیں ہم جس میں درا نہیں ہے
کچھ آرزو نہیں ہے کچھ التجا نہیں ہے
پائے طلب نہیں ہے دستِ دعا نہیں ہے
بندہ ہے رند مشرب کچھ پارسا نہیں ہے
پھولوں میں بو رہے کے بوئے ریا نہیں ہے
پھینکی کمند کیونکر قمری کے آشیاں پر
سرو چمن کا طرہ اتنا رسا نہیں ہے
ہے گلبن شگفتہ عہدِ شباب لیکن
رنگِ بقا نہیں ہے بوئے وفا نہیں ہے
نکلے جو میرے دل سے میری نہیں تمنّا
پیدا اثر ہو جس میں میری دعا نہیں ہے
کیوں تیری رہگذر میں بیمار سر نہ پٹکیں
تعویذ دردِ سر ہے یہ نقشِ پا نہیں ہے
بلبل کو عشقِ گل میں کیا خاک لطف ہوگا
تیرِ نگہ نہیں ہے تیغِ ادا نہیں ہے
نادل و دل نہ اتنے پھیلائیں پاؤں اپنے

یہ کارواں سرا ہے دولت سرا نہیں ہے

کیا جانے دردِ ہجراں کیا جانے آہِ سوزاں
ناصح مری طرح سے تو مبتلا نہیں ہے

یہ دل ودیعتِ حق اور معرفت سے خالی
آئینہ تو ہے لیکن اس میں جلا نہیں ہے

جاتی ہے غمزدوں کی فریاد اوپر اوپر
گنبد میں آسماں کے شاید صدا نہیں ہے

حیرت کا میری باعث جلوہ ہے خود تمہارا
تم آئینے سے پوچھو میری خطا نہیں ہے

کہنے سے تیرے ناصح چھوڑوں یہ ہرزہ گردی
تیری طرح سے میرا کچھ سر پھرا نہیں ہے

تسلیم آج ڈھونڈنے کو اس کے چلا تھا گھر سے
کھویا گیا خود ایسا جس کا پتا نہیں ہے

۱۵۸ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات ۱۳

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے
ہے آشنا وہ جو کہنے پہ آشنا کے چلے

فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آ کے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے

رواروی میں ہیں ہم سن لو قافلہ والو
کہ جن کو ساتھ ہو دنیا قدم اٹھا کے چلے

نمود عشرۂ پیری ہوا اجل آئی
چراغ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

نثار ہوجیے اس دل پہ جو ہو صاحب درد
وہ پاؤں چومیے جادہ پہ جو وفا کے چلے

یہ کیسا حسن کا نشہ یہ بول چال ہے کیا
زبان بہک کے چلے پاؤں لڑکھڑا کے چلے

سنا ہے برق کو اک لاگ ہے بلندی سے
بشر نہ حد سے زیادہ بھی سر اٹھا کے چلے

خدا کے واسطے اے صبر و تاب و ہوش و خرد
کہاں چلے کہ مجھے بیڑیاں پنہا کے چلے

یہ دیکھنا ہو کہ بس دل کی لاش اور میں ہوں
خبر نہیں یہ مجھے وار کب ادا کے چلے

کبھی جو آگئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے
دعائیں سن کے چلے کوسنے سنا کے چلے

نظارہ جس کا ہو عالم کو مایۂ حسرت
وہ راستہ میں نہ کیوں اپنا منہ چھپا کے چلے

جب اپنی آنکھ ہوئی بند سب کی آنکھ کھلی
جو گہری نیند میں تھے انکو ہم جگا کے چلے

دعا میں اور اڑا دے اے نظم تیری باتوں نے
رقیب جل کے اٹھے پیچ و تاب کھا کے چلے

۱۵۹ ——— ۸

اگر تو آرزوی خدمت مغاں داری
بیار از دل و دیں آنچہ ارمغاں داری

اگر درنگ و تأمل کنی زیاں بر تست
کہ صید بر ہدف و تیر در کماں داری

زمانہ در شفق خوں ہلال تیغ تو دید
تو آسمان دگر زیر آسماں داری

تو قریب تر از تو حریم جاناں نیست
و لیک نقش خودی را تو در میاں داری

درایں طلسم حوادث تو از چہ افتادی
کہ منزل آں طرف دور آسماں داری

گدائے کوچۂ محبوب راہمی زیبد — شکست طرف کلہ شوکت جہانداری
خضر بہ حالت تنہایت دلم سوزد — چہ لطف زیست کہ اندوہ جاودان داری

بنال نظم کہ این بزم میگسارانست
شراب درد تو در شیشۂ فغان داری

۱۶۰ — ۱۸

کتاں کی طرح جو نازک جگر نہیں رکھتے — وہ ذوق جلوۂ حسن قمر نہیں رکھتے
نہ دے سکیں گے ہمارا ساتھ رہروانِ طریق — وہ یوں قدم دمِ شمشیر پر نہیں رکھتے
سفینہ اپنا ہے صبر و رضا کے ساحل پر — امید و بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے
یہ راستی یہ تواضع جو سرو و بید میں ہے — شجر ہیں اور بھی ایسا ثمر نہیں رکھتے
مریضِ غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک — کہ چارہ گر تو امیدِ سحر نہیں رکھتے
اوڑا دی ای قدر افگن لگا کے تیر کوئی — ہوس ہے اوڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے
وہ لوگ جو ہیں رہِ مستقیم کے سالک — قدم اودھر نہیں رکھتے اودھر نہیں رکھتے
فروتنی سے کیا سرکشی کو یوں پامال — کہ جانتے ہیں کہ ہم تن پہ سر نہیں رکھتے
فلک زدہ ہیں شبِ غم کے جاگنے والے — سوائے رنگِ پریدہ سحر نہیں رکھتے
عزیز خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ — سرِ غرور بہ دل کینہ نہیں رکھتے
ستارہ ریزیِ شامِ طرب میں محو ہیں جو — نفس گدازیِ یادِ سحر نہیں رکھتے
ہمیشہ لالہ کے مانند لب ہے پر خندہ — مگر شکایتِ داغِ جگر نہیں رکھتے

دماغ اپنا بھی ہے لامکاں پر لیکن
فلک کی طرح سے دوران سر نہیں رکھتے

گلوں کو بھی دل و دعویٰ ہے نغمہ سنجی کا
زبان حال کی بلبل خبر نہیں رکھتے

دکھاؤنگا اونھیں پرسلہ چاک جیب شکیب
کہ زعم ہے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

فغاں میں بلبل شیدا کے نیشتر ہوں تو کیا
جو کوچہ رگ گل میں گذر نہیں رکھتے

فروغ بخش ہے چشم محبت احباب
شعاع مہر ہے تار نظر نہیں رکھتے

اونھیں کے حلقہ کا اے نظم جرعہ نوش ہوں میں
خبر کچھ اپنی بھی جو بے خبر نہیں رکھتے

١٦١ ١٧

جہاں کس کا ہے عمر گریز پا کس کی
یہ چلتی چھاؤں ہے ہوتی ہے آشنا کس کی

نگاہ اس سے لڑی دل کا غیر حال ہوا
گناہ کس نے کیا آ گئی قضا کس کی

وفور رشک سے محفل میں کہہ نہیں سکتا
لگا رہی ہے مجھے برچھیاں ادا کس کی

عدو ہے درپئے جاں دوست درپئے دل ہے
بیان کس سے کروں جا کے میں جفا کس کی

ٹپک پڑے ہیں جو مجنوں کے ذکر پر آنسو
یہ سچ بتا تجھے یاد آ گئی وفا کس کی

مجھی پہ رکھتے ہیں الزام میرے ہی غمخوار
برا کہے اسے طاقت ہے یہ بھلا کس کی

کسی طرح نہیں جاتا خیال زلف و کمر
یہ کیا ہوا مرے پیچھے پڑی بلا کس کی

وہ آ کھڑا ہوا بالین پہ اور میں اوٹھ بیٹھا
کدھر کا ضعف کہاں کا مرض دوا کس کی

قدم پہ اس کے گرا سامنے ہی ناصح کے
لحاظ کیسا کہاں کا ادب حیا کس کی

ہوا تھا سایہ دیوار میں گذر کس کے
اوڑالی تو نے سعادت پر ہما کس کی

سبک روی میں بھی غنچوں کے دل مسل ڈالے
یہ تیری چال میں شوخی ہے اے صبا کس کی

یہ کس حسین کی اتران ملی تجھے اے گل
ترے گلے میں ہے مسکی ہوئی قبا کس کی

یہ تیری عشوہ گری بے سبب نہیں نرگس
کھبی ہوئی تری آنکھوں میں ہے ادا کس کی

یہ تو ہے کیوں ہمہ تن گوش اے شگوفۂ باغ
یہ گونجتی ہے ترے کان میں صدا کس کی

چمن میں ڈھونڈھتے دیکھا ہے شاخِ گل تجھ کو
بلائیں لیں ترے ہاتھوں نے بارہا کس کی

یہ کس کے شوق میں اس کا جگر ہوا ہے لہو
پڑے پسے ہوئے پامال ہے حنا کس کی

عبث ہے آپ کو تغییر حال کا رونا
جناب نظم رہی ایک سی سدا کس کی

۱۶۳ —— ۱۷

رقیب کہتے ہیں آوازۂ شر یہ کس کا ہے
میں چپ ہوں رہنے بھی دو فتنہ گر یہ کس کا ہے

جگانے دیر میں واعظ یہ شب کو کیا گذری
کہ ایک شور تھا رندوں میں یہ کس کا ہے

نہ ساتھ لایا ہے کوئی نہ لے کے جائے گا
نہ بھول اس پہ ارے مال و زر یہ کس کا ہے

وہ زہد ہم میں جو تجھ تجھ کے کہتی ہے دوزخ
خدا کے واسطے دامانِ تر یہ کس کا ہے

جو دل جدا ہوا ہوتے دل کا غم تو ہے
جو وہ نہیں نہ سہی شکر کر یہ کس کا ہے

ابھی تو روٹھ کے وہ چل دئے تھے شوق سے دیکھ لیا
یہ کس نے بات کی پھر منہ ادھر یہ کس کا ہے

جھکا ہوا ہے نہ کیوں کسی کے ... تری
کہ اپنے گھر کو یہ کہتا ہوں گھر یہ کس کا ہے

یہ کب کے دوست ہیں سر کو اس سے پوچھتے ہیں
کہ داغ خون تری تلوار پر یہ کس کا ہے

بھڑک کے غیر سے کیسا نکل گئے ہو تم ہ
یہ آگ کس کی لگائی ہے شرر یہ کس کا ہے

لگاؤ تم اسے چھریاں کہ پائمال کرو
قسم تو ہم سے جو پوچھیں جگر یہ کس کا ہے

ادا کا وار بھی چل جائیگا خبر تھی سے
میں دیکھتا تھا کہ تیر نظر یہ کس کا ہے

بنایا سرمہ دنبالہ دار کو جو سنا
شکار آپ کو مد نظر یہ کس کا ہے

نہ منہ لگاؤ رقیبوں کو ہم نہ کہتے تھے
زباں بگڑ گئی دیکھو اثر یہ کس کا ہے

غرض سبھوں کا ساری ہی بزم عیش میں بھی
خبر ہی جام [illegible] دان سر یہ کس کا ہے

کھلا نہ خانہ تن کا بھی اپنے کچھ اسرار
کہ اس مکان میں آخر گذر یہ کس کا ہے

اگر اجل سے ڈریں بھی تو کیا سمجھ کے ڈریں
یہ انتظار ہمیں عمر بھر یہ کس کا ہے

تو روز حشر بھی میں نشہ میں جو رہی انکے ظلم
خدا سے سامنا اے بے خبر یہ کس کا ہے

١٦٣ —— ١٦

نہ اُڑ تری بام سے جب تک دو پہر گذرے
ہم ایسے سایہ دیوار سے بھی در گذرے

جو وار کرنا ہو سفاک کو تو کر گذرے
کہ آپ تیغ کہیں سر پہ ہاتھ بھر گذرے

جہاں کی سیر میں انساں بے خبر گذرے
بسان ابر یہ لازم بچشم تر گذرے

کمند آہ کو پھینکوں میں بام گردوں پر
جو گیسوئے شب دیجور تا کمر گذرے

ہماری غنچہ دل سے وہ پھول ہی اچھے
جنہیں ترے خم گیسو میں رات بھر گذرے

ترا نشانہ غیر کو تو نے بنایا تھا جن کا / وہ سب خدنگ مرے دل سے بیشتر گذرے
تڑپ کے رہ گیا کوئی تو اس کو کیا پروا / کرشمے اپنے نگاہوں سے بیشتر گذرے
غم و الم کی جو راتیں ہیں وہ نہیں کٹتیں / خوشی کے دن تو ادہر آئے بس ادہر گذرے
فقیر ہیں نہیں جھکتے مگر کسی سے ہم / اسی روش پہ سلاطین تاجور گذرے
بہک تمارہ گیا واعظ طریق عرفاں میں / خضر کبھی نہ ادہر راہ بھول کر گذرے
گہر سمجھ کے اٹھا لیتے خاک سے ہم کو / نہ اس طرف سے کبھی صاحب نظر گذرے
نہ ہم نے ہاتھ سے سر رشتہ وفا چھوڑا / ہزار ظلم و ستم ایک جان پر گذرے
بنا ہر ایک نفس برق خرمن ہستی / جنوں سے دہر میں آپے سے جب صورت شرر گذرے
دلوں میں گھر ہے زبانوں پہ ذکر ہے اب تک / کہیں نشاں نہیں ان کا جو نامور گذرے
جو سمجھے حرمت میخانہ تو تو اے واعظ / ادہر سے گذرے تو احرام باندھ کر گذرے

مجھے بھروسہ ہے اعظم اوس کی رحمت کا
یقین ہے میری گناہوں سے وہ بھی درگذرے

۱۶۴ —— ۱۹

شب فراق میں کب تک قضا نہیں آتی / میں دیکھتا ہوں کہ کیونکر بھلا نہیں آتی
نگہ کے چلتے ہیں تیر اور صدا نہیں آتی / یہ سنتے آئے ہیں لیکر قضا نہیں آتی
یہ کس ادا سے پریشاں ہوئے ترے گیسو / کہ جیسے ہوش میں باد صبا نہیں آتی
ترا شہید محبت ہے زندہ جاوید / جنازہ دفن بھی کیا اور قضا نہیں آتی

بلاکشانِ غمِ عشق کو مبارک ہو
کہ دردِ دل کی کسی کو دوا نہیں آتی

جو پوچھو رازِ حقیقت تو پوچھ رندوں سے
کہ اس طرف کی خبر جا بجا نہیں آتی

غرورِ حسن بتوں کا وہ کوہِ تمکیں ہے
پکارو لاکھ پلٹ کر صدا نہیں آتی

نہ سیکھے گا کہیں آئینہ سے بے شرمی
کہ اوس کی آنکھ میں مطلق حیا نہیں آتی

جفا کا ذکر جو چھیڑا کہا نہیں سنتے
وفا کو اوس سے جو پوچھا کہا نہیں آتی

جواب صاف ملا ہر طرف سے قاصد کو
اجل بھی ناز سے کہتی ہے جا نہیں آتی

تمہیں جہاں کے حسینوں سے لے گئے بازی
کسی کو چال تمہارے سوا نہیں آتی

غم و الم کا ہے رونا نہ درد کا ہے گلہ
مجھے شکایتِ اہلِ وفا نہیں آتی

نہ جانے بچھڑے ہوئے دوست پھر ملیں نہ ملیں
وہ راہ ہے کہ صدائے درا نہیں آتی

شبِ فراق میں ہے آہِ نارسا سے عجب
کہ آگ خرمنِ مہ میں لگا نہیں آتی

خدا کے سامنے جاتے ہو کس طرح دیکھیں
کسی سے شرم تمہیں تو ذرا نہیں آتی

پیام لا کے کسی کا یہ ہو گیا ہے غرور
بغیر ناز کئے اب صبا نہیں آتی

کریں گے دہر سے کیا شکوہ نامرادی کا
ہمیں کو خود طلبِ مدعا نہیں آتی

اثر کے عرشِ بریں سے مراد آتی ہے
یہاں زبان سے لب تک دعا نہیں آتی

جو منع ہوتیں یہ مستیاں بہار میں نظم
تو جھوم جھوم کے کالی گھٹا نہیں آتی

نکالے پیچ مجھی پر مرے سکھائے ہوئے
چلے مجھی پہ وہ فقرے مرے بتائے ہوئے

چلے گا سرو جو دامن کو یوں اٹھائے ہوئے
کہوں گا منھ پہ یہ انداز ہیں اڑائے ہوئے

جو بزم انس میں ہیں تجھ سے لو لگائے ہوئے
تمام خلق سے بیٹھے ہیں منہ پھرائے ہوئے

کہو فلک سے گریباں ذرا بچائے ہوئے
چلا ہے نالۂ دل آستیں چڑھائے ہوئے

لٹک پڑا ترا آنچل تو سیکڑوں فتنے
اوٹھیں گے دامن محشر میں منہ چھپائے ہوئے

کہیں چھپائے سے چھپتی ہے شب کی بیخوابی
نگاہیں کہتی ہیں جادو ہیں جگائے ہوئے

خبر کسے کوئی ان کو مری اسیری کی
جو ہیں ہوائے چمن کا فریب کھائے ہوئے

گر آفتاب قیامت نہ گرمیاں تم سے
ہم آپ ہیں عرق شرم میں نہائے ہوئے

حساب ہم سے بروز شمار کیا ہوگا
کہ چند روز میں وہ بھی گئے بھلائے ہوئے

جنوں نے دیر کا رکھا ہمیں نہ کعبہ کا
ٹھکانے چھوٹ گئے سب لگے لگائے ہوئے

متاع صبر و خرد اک نگاہ میں لے لی
یہ کب سے بیٹھے تھے مجھ پر ادھار کھائے ہوئے

غرور حسن غرور شباب استغنا
شراب کی ہیں کئی بوتلیں چڑھائے ہوئے

اونہیں ہے رشک حسینوں میں دیکھ کر مجھ کو
لگی ہے آگ کہ پھرتے ہیں تلملائے ہوئے

مری طرف نگہ ناز او رعتاب آمیز
نگاہ تیر بھی اور زہر میں بجھائے ہوئے

ہنسی تبھی آ گئی ادہم کو بزم عالم میں
ابھی تو آنکھوں میں آنسو تھے ڈبڈبائے ہوئے

[illegible] پیر مغاں [illegible]
کہ جیسے حضرت موسیٰ ہیں تاب لائے ہوئے

کیا ہو قصد تو سینا نہ سے نکلنے کا
نگاہ تھم سے ہیں کچھ پاؤں لڑکھڑائے ہوئے

[illegible]

حصول ملے تجھے کوثر پہ اس کا اے ساقی
کہ مے کدے سے ہی چلے پیاس ہم بجھائے ہوئے

وہ چاہے قتل کرے چاہے وہ رہا کر دے
کھڑے ہوئے ہیں گنہگار سر جھکائے ہوئے

گلہ کروں گا نہ میں جو نصیب کا لکھا
قلم چلا ہیں بے ہاتھ کے لکھے ہوئے

بروز حشر میں انکا مزاج پوچھوں گا
رہے جو وعدے پہ ہیں اعتبار لائے ہوئے

اب اوس سا تجھے جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں میں
زہے گدا جسے خاک میں ملائے ہوئے

نظر لگے نہ کہیں آفتاب محشر کی
کفن میں لے چلے داغ وہ چھپائے ہوئے

اوٹھائے صور قیامت نہ خواب سے [illegible]
[illegible] تیری شب غم کی [illegible] سلائے ہوئے

پیالہ پینے کو مجھے ہو گر تو ہاں ندو
نظر سے [illegible] کی نظر ملائے ہوئے

چلا ہے نظم کہاں کشمکش مرشد کی
بغل میں شیشہ دل سے [illegible] لگائے ہوئے

۱۸ —— ۱۲۶

حسین ہو کے تکبر ضرور ہوتا ہے
ادا میں فتنہ نگہ میں فتور ہوتا ہے

جو ہونے والا ہے وہ تو ضرور ہوتا ہے
بری بلا یہ دل ناصبور ہوتا ہے

ہر ایک شے سے اسی کا ظہور ہوتا ہے
کہ آفتاب کا ذروں میں نور ہوتا ہے

ہر ایک قطرے میں دریا ہے کوئی کیا جانے
یہی سمجھتے ہیں جن کو شعور ہوتا ہے

زہے غبار شہیدان حسرت دل لیے
اوٹھے تو عرش جو بیٹھے تو طور ہوتا ہے

بھلا سحر تو شب ہجر کی کہاں لیکن
کفن سپیدہ صبح نشور ہوتا ہے

ہوا بہشت کی آتی ہے جب تو ساغر میں — چھلک کے جام شراب طہور ہوتا ہے

دل اپنا آپ سے دیتا نہیں کسیکو کوئی — یہ ظلم ہوتا ہے اور بے قصور ہوتا ہے

جسے نہ ریزہ مینا کی طرح کیوں توڑیں — کوئی بھی نشہ میں اس طرح چور ہوتا ہے

قیام کب ہے جو حاصل بھی ہو فراوانی — ہوا پہ سایۂ بال طیور ہوتا ہے

سرائے دہر میں ہے کون آشنا کس کا — کہ صبح و شام ورود و صدور ہوتا ہے

فروتنی میں کچھ ایسی ادا نکلتی ہے — کہ انکسار پہ اپنے غرور ہوتا ہے

کیا نشیب و فراز جہاں کو جب ہموار — نہ دل میں رنج نہ پیدا سرور ہوتا ہے

نہیں علاج منافق کی روسیاہی کا — جو دل ہو صاف تو چہرے پہ نور ہوتا ہے

اوسے کرم پہ ہے اصرار ہم کو عصیاں پر — اودھر سے عفو ادھر سے قصور ہوتا ہے

لیا ہے اوس نے ہر اک سے وصال کا وعدہ — اس اشتیاق میں مرنا ضرور ہوتا ہے

سراب ہے جسے سمجھے ہوئے ہوں میں دریا — کہ جتنا بڑھتا ہوں اوتنا ہی دور ہوتا ہے

جنوں نے کھینچا ہے دامن مرا اودھر اے نظم
ہر ایک خار جہاں نخل طور ہوتا ہے

۱۶۷ ———————— ۴

کہے سے سو ذرا پاس آکے بیٹھ گئے — نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے

کچھ اس ادا سے چلا ہے تو اوٹھ کے تھمے ہیں — کہ دل بھی ساتھ ترے نقش پا کے بیٹھ گئے

نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا — رلا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

سحر کو اوٹھتے ہیں وہ دیکھ کر کف رنگیں
اب آئینہ پہ بھی سکے حنا کے بیٹھ گئے

تڑپنا دیکھ سکے وہ نہ صید کا اپنے
نشانہ تیر نظر کا لگا کے بیٹھ گئے

یہ بزم بادہ کشوں کی ہے حضرت واعظ
غضب کیا یہ کہاں آپ آ کے بیٹھ گئے

جو در پہ اس کے ٹھہرنے دیا نہ دربانے
تو سامنے در دولت سرا کے بیٹھ گئے

چلا جو تیر تو سینہ سپر کیا ہم نے
اوٹھی جو تیغ تو گردن جھکا کے بیٹھ گئے

فلک سے کیا طلب مدعا کرے کوئی
در قبول پہ پہرے قضا کے بیٹھ گئے

کھڑے ہوئے تھے سلاطین کے جو بلند مکاں
عروج اپنا فلک کو دکھا کے بیٹھ گئے

گرائے ابلق ایام کب وہ گرتے ہیں
جو شہسوار پڑی جما کے بیٹھ گئے

نظر کہیں نہیں اب آتے حضرت ناصح
سنا ہے گھر میں کسی مہ لقا کے بیٹھ گئے

قدم ہی اوٹھتا نہیں میکدے سے جانیکو
ابھی اٹھے تھے یہاں پھر سے آ کے بیٹھ گئے

وہ اب کہاں ہے جو پہلے تھا نظم رعالم
کہ سر پہ بار مصائب اٹھا کے بیٹھ گئے

۱۶۸ — ۹

ہوئے نہ ہم تو پشیماں کبھی وفا کرکے
تجھے بھی شرم کبھی آئی ہے جفا کرکے

سنبھلے حضرت زاہد یہ بزم رنداں ہے
بلا میں ہم تو پڑے آپ کی صلا کرکے

خوشی یہ ہے دم آخر تھا لب پہ نام ترا
کٹی ہے عمر کی منزل خدا خدا کرکے

نصیب میں ہے تو پہنچیگی بھیک گھر بیٹھے
در کریم پہ آئے چلے صدا کرکے

کسی کو حیف اس انجام کی نہیں ہے خبر — چلے جہاں سے کیا ساتھ اکو کیا کرکے
مآل دیکھیئے فوارہ کے اوچھلنے کا — خزانہ ہو گیا خالی ذرا اوڑا کرکے
ہوئی جو کچھ شنوائی جہاں کو ہے معلوم — ذلیل اور ہوئے ان سے التجا کرکے
زبان شعلہ سی گلخن میں برگ گل نے کہا — خدا فقیر بنائے نہ بادشا کرکے

بڑے بڑوں کا یونہی زور ڈھے گیا اے نظم
کوئی جہاں میں برپا ہوا جفا کرکے

۱۶۹ — ۱۳

مزہ بہار کا ہے تو اے جنوں نکلے — شکست توبہ سے آواز ارغنوں نکلے
جو تیرے دور میں ہم لے کے سہر دوں نکلے — خراب میکدہ جام و اژگوں نکلے
مراد مانگنے بیٹھے گو ہم شگوں نکلے — کہیں نہ بھیس بدل کر وہ ذو فنوں نکلے
کسی کی چشم سخن گو کے جو اشارے ہیں — نظر پری تو سب افسانہ و فسوں نکلے
ستارے شام کے ڈوبے ہوئے سحر [illegible] — سحر کو نکلے تو با حالت زبوں نکلے
وہ اہل ذوق جو خلوت گزیں [illegible] — [illegible] جنوں [illegible] نکلے
دل و جگر یہ نہیں نازک تھا گر وہ بھی — [illegible] نکلے
[illegible] فلک سمجھے طرز فغاں [illegible] — کسی طرح [illegible] کچھ آتش دوراں نکلے
اگرچہ حسن کو تھی حب شیر کی خواہش — پکارا عشق کہ تیشہ سے جوئے خوں نکلے
عجب نہیں ہے کہ یہاں سرکشی کرے انساں — جہاں کہ سات فلک ہو کے سرنگوں نکلے

تمہارے جلوہ کے آگے کسی کی ہستی ہے
تمہارے سامنے کس کی زبان سے ہوں نکلے

وہ شب کی دست درازی اسی نے الٹ ہے
سحر کو ہاتھ جو دیکھے تو نیلگوں نکلے

زمین شعر جواہر کی کان ہے اے نظم
کمال یہ ہے کہ جو مس سے میں کہوں نکلے

١٧٠ — ١٩

چلی صبا کہ چمن میں گذر نہیں نہ سہی
کھلے شگوفہ کہ مٹھی میں زر نہیں نہ سہی

نمود بو دسرا بستان کی فکر عبث
اگر ہے کچھ تو ہمیں کیا اگر نہیں نہ سہی

فزوں حکایت تیر نگہ میں کیا کم ہے
اگر شکایت زخم جگر نہیں نہ سہی

نہ کوئی بات کہیگا دہن نہیں تو نہ ہو
نہ کوئی نام دھرے گا کمر نہیں نہ سہی

کب اپنے حال کی مجھ کو خبر ہے اے ناصح
اگر وہ حال ہے میری خبر نہیں نہ سہی

شب ہجر صبح نہ آئے تو خواب مرگ تو آئے
سن اے فلک شب غم کی سحر نہیں نہ سہی

تمہیں تو اپنے تغافل پہ ناز ہے بارے
مجھے تحمل درد جگر نہیں نہ سہی

ٹھہر کے بزم شب تیرہ دیکھ لے اے چرخ
جو ایک رات یہ دوران سر نہیں نہ سہی

[illegible] ہیں جو کلیاں تو پھول مشت پر
غرض کہ سمجھئے نالے اثر نہیں نہ سہی

[illegible] ہے ساقی
او دختر رز کوئی ساغر ادھر نہیں نہ سہی

ابھی سے سر پہ سوار او سیاہ تیرے رخ
قدم تو اب نہیں مٹنے کا سر نہیں نہ سہی

شہید ہونے کو رکھا ہے پاؤں مقتل میں
ظفر نصیب میں ہاں تیغ و سپر نہیں نہ سہی

کسی کی آہ سے پتھر تو ہو چکا پانی
کسی کے دل پہ جواب بھی اثر نہیں نہ سہی

ترا خیال ہے اور میں ہوں اور دلِ بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

ہمارے دل میں تو ہر لحظہ ہر گھڑی ہو تم
تمہاری بزم میں اپنا گذر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ مٹ جائیں
دماغ تو ہے وہی تاج زر نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہل توکل کو روکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

یہی سمجھ کے سناتا ہوں درد دل اپنا
کہ جی تو بہلے گا اس کا اثر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اگل رہا ہے نظمؔ
جہاں میں گر کوئی حافظ نہیں نہ سہی

یہ نہ میں سمجھا نکالا تو نے بزم انس سے
لے گئی در دشت امکاں کیطرف وحشت مجھے

دل کی محویت کا وہ عالم ابھی تک یاد ہے
آپ میں آنے کی ممکن ہی نہ تھی فرصت مجھے

محو و نمائی کا عالم خود پرستی کا ہے دور
بیخودی رہتی ہے اب ایسی نہ محویت مجھے

مجھ کو منزل سے خودی کی ہے سفر تیرے طرف
ہو گئی تیری جدائی عالم غربت مجھے

جتنا بڑھتا ہوں میں اتنا پیچھے ہٹا جاتا ہوں
دور کرتی رہتی ہے مجھ سے مری حیرت مجھے

آسماں میں تو نہیں ہے لامکاں میں تو نہیں
تجھ کو پا سکتا نہیں میں لاکھ ہو رفعت مجھے

اک نمائش ہے سراب ریت کی سارا جہاں
ایک باغ سبز سے بڑھ کر نہیں جنت مجھے

شان تیری یہ کہ بے مانگے دو عالم دیدیا
حال میرا یہ کہ اب بھی رہ گئی حسرت مجھے

ہو گئے کیا کیا ستم اب تو نہیں کچھ یاد بھی
دل تھا پہلو میں تو کرتے تھے کبھی فریاد بھی

میں تو صیدِ تازہ تھا چوکا مگر صیاد بھی
پلکیں ٹانکی تھیں تو سی دیتا لبِ فریاد بھی

تکیہ رکھتے ہیں خدا پر ہیں فقیر آزاد بھی
کم نہیں کملی سے ہم کو سایۂ شمشاد بھی

دل فریبی پر تلے ہیں سرو بھی شمشاد بھی
جاں ستانی پر کمر باندھے ہوئے صیاد بھی

میں بھی اس گلشن میں ہوں اور خانۂ صیاد بھی
نالہ وہ کھینچوں کہ جس میں برق بھی ہو باد بھی

غم نہیں اس کا اگر میں ہو گیا برباد بھی
دل تو ہے پہلو میں اور دل میں تمہاری یاد بھی

یاد ہے شیون بھی مجھ کو نالہ بھی فریاد بھی
آپ کو مرغوب کیا ہے کچھ تو ہو ارشاد بھی

اب تو قائل ہے وفا کا وہ ستم ایجاد بھی
ظلم بھی ہے رحم بھی ہے داد بھی بیداد بھی

کم نگاہی اس قدر بے التفاتی اس قدر
اک نگہ پر ہم بکے بھی ہو گئے آزاد بھی

آنکھیں پھوٹیں اوس کی جو منکر ترے جلوہ کا ہو
دیکھتا ہے یہ کرشمے کور مادرزاد بھی

رشکِ یکتائی کہاں تک تا کجا قہر و غضب
خاک میں تو ل چکے نمرود بھی شداد بھی

دیکھنا اس خوابِ نوشیں کو نہ چونکے ہم ذرا
شور تھا تم بھی رہا شورِ مبارکباد بھی

کی سوادِ شہرِ خاموشاں نے کچھ ایسی کشش
منزلوں پیچھے رہی مجھ سے مری فریاد بھی

سایۂ گلبن میں بلبل کو اترتے دیکھ کر
چال پرچھائیں کی سی چلنے لگا صیاد بھی

دل سے بھاتی ہے وفا اہلِ وفا کی اسقدر
جان دے کر مول لوں درد سر فرہاد بھی

ایک تو منزل کٹھن ہے اور پھر ہر گام پر
حادثہ پر حادثہ افتاد پر افتاد بھی

قطعہ

حشر میں ظالم نے یہ کہہ کر گلا گھونٹا مرا
ایک تو اپنا قصور اور اس پہ یہ فریاد بھی

میں تو اب چپ ہوں مگر اس خونِ ناحق کا گواہ
دامنِ جلّاد بھی ہے خنجر فولاد بھی

لوحِ دل سے نقشِ ہستی کو مٹا کر بارہا
توڑ ڈالا ہے طلسم عالم ایجاد بھی

میرے اشک و آہ پر جو باندھنے باندھے گئے
یوں نہ اٹھا تھا کبھی طوفان ابر و باد بھی

سیج پر پھولوں کی اس نے کروٹیں لیں رات بھر
گذر گیا تھا ہار میں شاید دلِ ناشاد بھی

ناز اس بوٹا سے قد پر کیوں نہ ہو زیبا تجھے
جھومتے ہیں سرو بھی اٹھلاتی ہیں شمشاد بھی

یہ غزل خوانی نہیں اے نظم ہے صورتگری
بار بد بھی محوِ حیرت ہو گیا بہزاد بھی

۱۶ ۱۶۲

پھر ہوں میں جب سے جوشِ عشق میرے دل میں ہے
زور و شورِ موج کا پیدا اثر ساحل میں ہے

ابرتر ہے یا کہ ہے خمخانۂ کیف بہار
شاخِ گل ہے یا کہ پیمانۂ کفِ سائل میں ہے
تھی لہو کی چھینٹ باقی میرے جسم زار میں
وہ بھی کچھ تلوار میں کچھ دامن قاتل میں ہے
مر مٹے دریا تلک آ آ کے لاکھوں تشنہ لب
استخوانوں کی صدا خمیازۂ ساحل میں ہے
جان دینے کا مزہ اہل وفا سے پوچھئے
مر چکے ہیں پھر بھی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
دیدۂ بیدار میں ہے ہُو کا عالم ہر طرف
بزم ہستی خواب ہے اور دیدۂ غافل میں ہے
میں کسی کے منہ پہ رکھوں بات یہ عادت نہیں
ورنہ ہے میری زبان پر جو تمہارے دل میں ہے
کچھ نہ میں سمجھا کہ آخر میں ہوں تو یا تو ہی میں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے
کشتنی سمجھے لگے بس پھیرنے گردن پہ تیغ
یہ تو پوچھا ہوتا کچھ حسرت بھی تیرے دل میں ہے
ناتواں تھا میں اٹھا سکتا نہ سختی راہ کی

بات اتنی ہے کہ دم اٹکا ہوا منزل میں ہے

اس کی چشم سرگیں سے ہو رہا ہے قتل عام
مشعلیں روشن ہیں اور اندھیر اس محفل میں ہے

خونِ ناحق کا پتہ دیتی ہیں تیری شوخیاں
کچھ یہی انداز تو بیتابئ بسمل میں ہے

ناقہ ہے نخچیر مجنوں کی کمندِ آہ کا
بچ کے جا سکتی نہیں لیلیٰ اگر محمل میں ہے

کونسی جا جلوۂ جاناں نظر آتا نہیں
دل میں ہے آنکھوں میں ہے خلوت میں ہے محفل میں ہے

تیرا افسوں چل گیا عالم پہ اے زہرہ جبیں
ہند میں تو اور افسانہ ترا بابل میں ہے

کس مصوّر نے بنایا آنکھ کی تصویر کو
دیکھ لو سارا طلسماتِ جہاں اک تل میں ہے

۱۴ ۱۰۳

زندگی جن سے تھی وہ مجمع پریشاں ہو گئے
سخت جاں تھے ہم کہ پھر جینے کے ساماں ہو گئے

آکے مقتل میں ترے کشتے سلیماں ہو گئے

تیر جو اوڑتے ہوئے آئے تھے پریاں ہو گئے

حلق سے اوتری بھی تو اوتری لوہو کر شراب
پھر ساقی میں مجھے دو گھونٹ چھدریاں ہو گئے

مذہبِ اہلِ وفا میں رو کے میں مجرم ہوا
اشک گر کر آنکھ سے دست و گریباں ہو گئے

کیا بتاؤں رو رہا ہوں کب سے اے اہلِ جہاں
نوح کے کتنے ہی اس عرصے میں طوفاں ہو گئے

کبر جن کا بڑھ گیا حد سے وہ ہیں تنگِ جہاں
جو کہ جامہ سے ہوئے باہر وہ عریاں ہو گئے

آنسوؤں میں ہے مرقع مجمعِ احباب کا
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گئے

قصرِ قیصر تک فرشتہ جا نہ سکتا تھا کبھی
کیا قضا آئی تو اندھے سب نگہباں ہو گئے

جان جائیگی نہ چھوڑیں گے ورمینا اب
ہم تے دیر پیرِ مغاں سے عہد و پیماں ہو گئے

رہ گئے جی کھول کر رونے کی جو ارمان تھے
چبھتے چبھتے دل میں آخر زخمِ خنداں ہو گئے

کیا سمجھ کر جان دینے کو کہا تھا آپ نے
دیکھ کر لاشہ کو کیا جلدی پشیماں ہو گئے
دی جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے
مڑ کے دیکھا اوس نے دل سینوں میں بسمل کر دئے
منھ اودھر پھیرا تو جو بسمل تھے بے جاں ہو گئے

۱۷۴ ولہ ۱۶

دیکھنا شورش و فورِ گریۂ سرشار کی
گرد ہو کر بیٹھی جاتی ہے گھٹا اُس پار کی
سنگِ بارانِ ستم کا ہو رہا ہے مشورہ
کرتی ہیں گردوں سے باتیں چوٹیاں کہسار کی
ہم نے وہ میدان مارا ہو کہ جس میں ہر طرف
آرزو کا خون ہے یا لاش ہے پندار کی
شش جہت ہے اک گھروندا رہ گذار سیل پہ
جس میں گردوں ایک چلتی چھاؤں ہے دیوار کی
سب کو قسمت نے کیا ہے لاکے اس زنداں میں قید
رہنے والی ہے اجل جس گنبدِ دوار کی

جان دے کر مرکے پہنچا ساحل مرقد پہ میں
جھیل کر آفت بھنور کی موج کی منجدہار کی
صفحۂ عالم پہ طومار شب غم ہے رقم
مہر ہے اس پر ہمارے دیدۂ بیدار کی
بند ہو کر آنکھ پھر کھلنے کی ہے کس کو امید
لوٹ لے جتنی ہے دولت دیدۂ بیدار کی
دن جو ہیں اپنے خزاں کے کچھ بھلا لگتا نہیں
یہ فضا یہ چھاؤں یہ ٹھنڈی ہوا گلزار کی
ابر کو جوش جنوں میں دیکھ کر کہتا تھا میں
اوڑ رہی ہیں دھجیاں کیا دامن کہسار کی
موج ہے آب گہر کی مسکرا دینا ترا
شعلۂ یاقوت ہے جنبش لب گفتار کی
ہاتھ میں لے آئینہ کی طرح مشتاقوں کا دل
اوس میں صورت دیکھ اپنے نخوت و پندار کی
دیکھنے کی ہیں ادائیں سیکڑوں اور اک نگاہ
لکھی ہے قسمت میں گردش مردم بیمار کی
دشت حیرت میں تھا سرگرداں کو اٹھا گرد باد

کھل گئی مجھ پر حقیقت گنبد دوار کی
جلوہ اس کافر کا جب دیکھا تو رکھ دی ہاتھ سینے
مردم دیدہ نے سمرن آنسوؤں کے تار کی
نیم بسمل ہے نہ مرتا ہے نہ اب جیتا ہے نظم
پڑ گئی اوچھی سروہی ابروئے خمدار کی

۱۵ ۱۷۵

آ کے مجھ تک کشتیٔ مے ساقیا اولٹی پھری
آج کیا ندی بہی الٹی ہوا اولٹی پھری
آتے آتے لب پر آہ نارسا اولٹی پھری
وہ بھی میرا ہی دبانے کو گلا اولٹی پھری
مڑ کے دیکھا اوس نے اور وار ابرو کا چل گیا
اک چھری سیدھی پھری اور اک ذرا اولٹی پھری
اسکا نظارۂ رخسار روشن کی نہ تاب
جا کے آئینہ پہ چہرہ کی ضیا اولٹی پھری
راست بازوں ہی کو پیسا آسماں نے اِتدن
والے قسمت جب پھری یہ آسیا اولٹی پھری
جو بڑا بول ایک دن بولے تھے پیش آیا وہی

گنبدِ گردوں سے ٹکرا کر صدا الٹی پھری

رزق کھا کر غیر کی قسمت کا زنبور عسل
تو نے دیکھا حلق تک جا کر غذا الٹی پھری

توشتائش گر ہے اوس کا جو ہی تیرا مدح خواں
یہ تو اے مشفق ضمیر مرحبا الٹی پھری

جس پر آئی تھی طبیعت کی اوسی نے کچھ نہ قدر
جنسِ دل مانندِ جنسِ نا روا الٹی پھری

یا تو کشتی ڈوبتی تھی یا چلی ساحل سے دور
وائے ناکامی پھری بھی تو ہوا الٹی پھری

گرنے والا ہے کسی دشمن پہ کیا تیرِ شہاب
آسماں تک جا کے کیوں آہِ رسا الٹی پھری

جی گیا میں اوس کے آجانے سے دشمن مر گیا
دیکھ کر عیسیٰ کو بالیں پر قضا الٹی پھری

مر گیا بے موت میں آخر اجل بھی دور سے
کوچۂ قاتل کا پتلا کر پتا الٹی پھری

یعنی مرحبا یک میں جو ضمیر ہے یا مرحبا بہ مین ضمیر جو ان ذوی ضمیروں کی جگہ ضمیر متکلم مقصود ہے یعنی مرحبا بی ۱۲

ہجر کی شب مجھ کو اولٹی سانس لیتے دیکھ کر
ایک ہی دم میں وہاں جا کر صبا اولٹی پھری
ہے مرا ویرانۂ غم نظم کہ سا ہولناک
موجِ سیل آئی تو لے کر بوریا اولٹی پھری

۱۵ ۱۷۶

ایک دم کو حسنِ گل سے گلشن آرائی ہوئی
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
صبحِ پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرہانے اجل آئی ہوئی
خندہ زن گل۔ لب پہ غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی
اے صبا کچھ خیر ہے چال ایسی اٹھلائی ہوئی
اک قدم ہے اندرونِ خانہ اک بیرونِ در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
منہ سے نکلی بات اور طوفان پر طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی سی رسوائی ہوئی
مڑ کے میں دنیا و عقبیٰ کی طرف کیا دیکھتا
مانعِ وہم دو عالم تیری یکتائی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثلِ قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی

باغِ عالم میں بہارِ زندگانی ہو تو کیا
ایک ہی دل کی کلی اور وہ بھی مرجھائی ہوئی

کج روی طینت میں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی

کوئے رسوائی تلک آنے کو نہ اوٹھتا تھا قدم
دستگیر آخر کمندِ ناشکیبائی ہوئی

عشق کے شعلوں کو اب تو ہی بجھا اے چشمِ تر
یاد کر یہ آگ ہے تیری ہی بھڑکائی ہوئی

کھل گئے گل۔ عقدۂ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخنِ موجِ صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی

شام سے سوزِ شبِ غم نے مجھے دکھلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مردنی چھائی ہوئی

گنبدِ ا... وہ بھی ہے وہم و شک کی بازی گاہ کا
بات جو سمجھی ہوئی ہے یا ہے سمجھائی ہوئی

اٹھے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا علم

باعثِ ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

۳۶ | ۱۷۷

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیٔ ہنگامۂ بازارِ رسوائی نہ تھی
شغلِ خود بینی تھا شانِ بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشمِ تماشائی نہ تھی
کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح میں جھوم کر اٹھتا گھٹا چھائی نہ تھی
مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی
جنگلوں میں خاک چھانی ہے جوانی کے لئے
منزلوں گردِ رمِ آہوئے صحرائی نہ تھی
لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم زندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر انگڑائی نہ تھی

بقیہ:۔ اپنی ناشناسائی ہنگامۂ ممکنات کا باعث ہوئی یعنی ہم خود کو نہ پہچان سکے سمجھے کہ ہم بھی ہیں تو ساری کائنات کا ہونا لازم ہے ہر ناشناسائی یعنی عدم ادراک ہی ادراک عدم کا باعث ہوا اس طرح ممکن کے لئے عدم ترجیح ترجیح عدم کا باعث ہے ۱۲

ترک لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہوائے بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا کہ طبع یار بھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

جلوۂ گل کے بھی مشتاقوں میں ہم اک عمر تک
اور نرگس کی طرح آنکھوں میں بینائی نہ تھی

کون ہوں میں یاد ہوگا آپ کو یہ اے کلیم
برق ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جان تازہ بھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

چشم تر دیکھنا دامن کسی نے آج تک
رہگزار سیل میں دیوار اٹھوائی نہ تھی

سوتے سوتے شور محشر جاگ اوٹھا کس طرح
اے جنوں میں نے ابھی زنجیر کھڑکائی نہ تھی

ترک الفت کر کے نکھرا اور بھی کافر کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

دیکھنا ہے سیر اگر میرے تڑپنے کی تو دیکھ

یہ نہ کہہ بیٹھا کہ بسمل میں شکیبائی نہ تھی

ساتھ غیروں کے بھی تھے ہم بھی دورِ ساغر میں شریک
پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی

اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے لو ورنہ کہیں
یوں کبھی رنگِ حنا نے آگ بھڑکائی نہ تھی

وہ تو آنکلا تھا لیکن ہو گئی کیا جلد صبح
میں نے اب تک زلف بھی چہرہ سے سرکائی نہ تھی

بات کی تو نے تنِ بیمار میں جان آگئی
سچ بتانا پھر یہ کیا تھا گر مسیحائی نہ تھی

آگیا کیا چین مجھ کو گر کے اس کے پاؤں پر
یہ علاجِ دردِ سر تھا ناصیہ سائی نہ تھی

صورِ اسرافیل سے بس جاگنے والا نہ تھا
کیا کہیں تو نے تو آکر قبر ٹھکرائی نہ تھی

ہم سپہ کر تختِ پریوں کا نکالا جا نکہاں
اتنی بھی کو نہ کمندِ نا شکیبائی نہ تھی

کشتیِ مے پر ہے اب تختِ سلیماں کو بھی رشک
بادہ پیمائی تھی آخر بادِ پیمائی نہ تھی

قلزم مے میں ہیں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے
آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گذری ہے کیونکر سچ بتانا اے اجل
لاکھ بار آئی تھی تو کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں وہ دل ملا دیکھے نہیں
ان میں یکرنگی نہ تھی تو اون میں یکجائی نہ تھی

فرش استبرق بچھایا تھا نگاہ شوق نے
حشر کے دن ہم کو فکر برہنہ پائی نہ تھی

کیوں نکل کر تو ہوا خلوت سے زیب انجمن
حسن بے پردہ تھا جب تک تو یہ رسوائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست
عقدہ تھا دشوار اور ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اس شوخ کی
پوچھتا ہوں جب کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان
کیا تم آ جاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج

ورنہ کچھ تیری بساطِ چرخِ مینائی نہ تھی
ہم تھے ساقی تھا۔ ہمارا میکدہ تھا جام تھا
جب زمانہ میں بنا یہ چرخِ مینائی نہ تھی
میرے لب سے ہو گیا کیسا گُلِ رخسار سُرخ
تیرے لب سے برگِ گُل اس طرح شرمائی نہ تھی
راہ میں شل ہو گیا برہان و حجت کا قدم
پیروی عقلِ نادانی تھی دانائی نہ تھی
پوچھتا ہے نظم مجھ کو نرگسِ بیمار سے
کیوں چلی آئی چمن میں گر توانائی نہ تھی

۱۱ ۱۷۸

شرم یہ کیوں یہ تبسم ہائے پنہاں کس لئے
سر پہ آنچل کس لئے منہ پر ہے داماں کس لئے
غور کر طرزِ جفا کو دیکھ اندازِ وفا
تیغ گریاں کس لئے ہے زخم خنداں کس لئے
کھول کر بندِ کفن پوچھے کوئی احباب سے
منہ چھپا کر جاتے ہیں اس گھر سے مہماں کس لئے
سر بزانو ہے توکل تن بہ آغوشِ رضا

ذکرِ سرکس واسطے ہے فکرِ ساماں کس لئے

صحبت بے مغز گر اندازِ ساماں ہوتی نہیں
دردِ سر رکھتا ہے پھر شیرینستاں کس لئے

سن کے حرفِ آرزو جامہ سے کیوں باہر ہوئے
خیر ہے کچھ ہو گئے شمشیر عریاں کس لئے

منھ سے تو نے کہہ دیا جو آ گیا مجھ کو یقیں
جھوٹی قسمیں کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے

ہو کے تائب شیخ سے بیعت بھی کر کے دیکھ لی
جا کے اب باندھوں نہ پیمانے سے پیماں کس لئے

اک نگاہِ لطف ہو اوس کی تو یہ سب ہیں نثار
جان و دل کس واسطے ہیں دین و ایماں کس لئے

خضر بھی ہیں غرقِ گردابِ اجل میں ایکدن
اے سکندر ہے تلاشِ آبِ حیواں کس لئے

کس بہارِ حسن سے اے نظمؔ تھا تو ہمکنار
چاک ہیں گل کی طرح جیب و گریباں کس لئے

6 | ۱۷۹

مے پلا ساقی ارے فصلِ بہار ایسے میں ہے

آبِ حیواں دے حیاتِ مستعار ایسے میں ہے
سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگامِ مے نوشی نہیں
مجھ کو جلدی ہے کہ دستِ اختیار ایسے میں ہے
پھر نہ یہ سمرن ملے گی یادِ حق کے واسطے
آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے
وقت ہے حمیدِ رمیدہ جاکے آنیکا نہیں
وار کرنا ہو تو کر زود پرشکار ایسے میں ہے
بعد اس کے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا
پھیر دے آکر چھری دل بے قرار ایسے میں ہے
دیکھ تو حیدر کوئی تیرا ابھی ہے پرسانِ حال
چند ساعت اور ابھی روزِ شمار ایسے میں ہے

۱۸ ۱۸۰

سنگ پانی ہونے کو پانی ہوا ہونے کو ہے
دیکھ اے منکر ابھی دنیا فنا ہونے کو ہے
پرسشِ اہلِ گنہ روزِ جزا ہونے کو ہے
گرمیٔ بازار جنسِ ناروا ہونے کو ہے
اپنی بے صبری سے عکسِ مدعا ہونیکو ہے

آئینہ دار اثر دست دعا ہونیکو ہے
دل وہی دل ہے جو اس کا مبتلا ہونیکو ہے
جان ہے وہ جان جو اس پر فدا ہونیکو ہے
ایڑیوں تک دوش سے گیسو رسا ہونیکو ہے
پڑھتے ہی بڑھتے یہ افعی اژدہا ہونیکو ہے
قتل سے میرے پشیماں بے وفا ہونیکو ہے
اک ستم تو ہو چکا اب دوسرا ہونیکو ہے
گو سراپا مثل ناخن ہوں گرہ کچھ غم نہیں
خاک ہو جانا مرا عقدہ کشا ہونیکو ہے
بزم میں ساغر کسی کے واسطے کوئی بھرے
میں سمجھتا ہوں کہ میری ہی صلا ہونیکو ہے
شان اُس کی دیکھ کر سمجھے تھے ہم روز الست
دولت کونین بے مانگے عطا ہونیکو ہے
کس طرح بازو پہ میں باندھوں دعائے چشم زخم
اوس کی سغا کی پہ شور مرحبا ہونیکو ہے
ہاتھ سے آئینہ جب رکھا تھا سمجھا تھا یہ میں
ہو چکا ہے تیز خنجر اب جفا ہونیکو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہے خیالِ خالِ رخ
دانۂ زنجیر کو نشو و نما ہونے کو ہے

یاس میں مجھ کو تسلی دے رہی ہے بیخودی
پردہ اب اوٹھنے کو ہے اب سامنا ہونیکو ہے

چپکے چپکے ظلم کرنا چھپ نہیں سکنے کا اب
ناوکِ بیداد میں پیدا صدا ہونیکو ہے

فکرِ بیجا سے منغص کیجیے کیوں عیش کو
یہ تو ہے معلوم قسمت کا لکھا ہونیکو ہے

چل کے زنداں وگریباں کے ستم کی داد دو
مژدہ اے اہلِ جنوں محشر بپا ہونیکو ہے

آ گیا ہے شرمِ عصیاں سے جو آنسو آنکھ میں
یہ کے رخساروں پہ دُرِّ بے بہا ہونیکو ہے

یہ نگارستانِ ہستی مظہرِ قدرت سہی
نقش ہو گر آبِ حیواں پر فنا ہونے کو ہے

۱۵ ولہ ۱۸۱

لہر میں دریائے ہستی کی حباب آنیکو ہے
جو کوئی آنیکو ہے پا در رکاب آنیکو ہے

حُسن کی آئینہ داری کو شباب آنیکو ہے
زلف میں بل گیسوؤں میں پیچ و تاب آنیکو ہے
مژدہ اے دل پھر ہوائے انقلاب آنیکو ہے
دورِ گردوں ہو چکا دورِ شراب آنیکو ہے
آنکھ میں تیری مروّت بھول کر آتی نہیں
شرم سو سو بار آنے کو حجاب آنیکو ہے
کہہ دیا بس۔ فال بد منہ سے نہ او واعظ نکال
مجھ پہ رحمت اُو تری گی تجھ پہ عذاب آنیکو ہے
جا چکی تاب و تواں بس اب ہے اتنا انتظار
زندگانی کیطرف سے بھی جواب آنیکو ہے
پتلیاں پتھرا چلی ہیں کہتے کرتے انتظار
چارہ گر خوش ہیں کہ اب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے
دیکھیے کیا رنگ ہو محفل کا اہلِ مصر کی
ہاتھ میں چھریاں ہیں یوسف بے نقاب آنیکو ہے
ہجر کی اک شب میں گھڑیاں بج چکی ہیں دو ہزار
اے فلک سمجھوں گا میں روزِ حساب آنیکو ہے
سونے والو وقت آخر ہو گیا اب تو اٹھو

لے کے آئینہ لبِ بام آفتاب آنیکو ہے

شیشۂ توبہ نہ جوشِ کشمکش میں ٹوٹ جائے
جھوم کر صحنِ گلستان میں سحاب آنیکو ہے

آگئی عارض پہ سرخی ہر طرح سے ہے ستم
یا حجاب آنیکو ہے یا اب عتاب آنیکو ہے

خانۂ دل سے اوٹھائیں اپنا بستر صبر و ہوش
اس سرا میں کاروانِ اضطراب آنیکو ہے

جوشِ گل کی کشمکش میں آگیا سبزہ کو غش
شیشۂ شبنم میں کھنچ کھنچ کر گلاب آنیکو ہے

نظم دیکھیں مصطفیٰ کا جانشیں ہوتا ہے کون
عرش سے مسجد میں حکمِ سدباب آنیکو ہے

۱۶ وله ۱۸۲

جشنِ جم کا ماجرا بادِ صبا سے پوچھ لے
کیا ہوا تختِ سلیمانی ہوا سے پوچھ لے

داورِ حشر آرزوں کا نکلنا تو کجا
جان بھی مشکل سے نکلی ہے قضا سے پوچھ لے

کشتۂ تیغِ تغافل کی نہیں تجھ کو خبر

میں بتاؤں تجھ کو تو اپنی ادا سے پوچھ لے

پوچھنا کیا ہے کسی سے دل کو دل کی ہے خبر
سارا حال اس ساغرِ گیتی نما سے پوچھ لے

دو گواہوں سے پریشانی کا میری ہے ثبوت
گر تجھے باور نہیں زلفِ دوتا سے پوچھ لے

ہر قدم پر آتی ہے شہرِ خموشاں سے صدا
خاک میں ہم مل گئے ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

اے جنوں لے چل کسی جنگل میں ہے جوشِ بہار
راہ جنگل بن کے اس کالی گھٹا سے پوچھ لے

آ گیا آتش قدم کھینچنے پہ تنہا اس قدر
جھوٹ کیا ہے شعلۂ رنگِ حنا سے پوچھ لے

لوٹنا بھی دل کا ظالم دیکھنے کی سیر ہے
آنکھ اوٹھانے کے لئے شرم و حیا سے پوچھ لے

زالِ دنیا کے فریب و مکر سے غافل ہے تو
بے وفائی اس کی مردانِ خدا سے پوچھ لے

جوشِ مستی میں نہ آشنا بے حجابانہ گذر
راہ میں آنکھیں بچھی ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

ہے زبانِ شمع خاموشی میں بھی صرفِ سخن
بزمِ ہستی کی خبر اہلِ فنا سے پوچھ لے

صفت کا جھگڑا ہو گر پھرنا پڑے مثلِ ضمیر
دور کیوں جا تو خبر کو مبتدا سے پوچھ لے

منفعل ہو تو نہیں ہے اس کی رحمت میں کمی
چشمِ تر سے پوچھ لے دستِ دعا سے پوچھ لے

جس ہنر سے خود ہو عاری سیکھ لے اوستاد سے
راستہ جو بھول جائے رہنما سے پوچھ لے

پھر شکیبائی کا دعوی ہو چلا ہے نظم کو
پھر مزاج آ کر ذرا ناز و ادا سے پوچھ لے

۷ ۱۸۳

منزلوں کو عشق کی اہلِ جنوں سے پوچھیے
حال یہ یارانِ نجد و بے ستوں سے پوچھیے

دل کے خوں ہونے کی حالت اشکِ خوں سے پوچھیے
جان پر کیا بن گئی سوزِ دروں سے پوچھیے

آسماں سے کیجئے باتیں ذرا بن کر غبار
وجہ بربادی کی کچھ گردونِ دوں سے پوچھیے

سن سکیں گے آپ کیونکر دل کی بیتابی کا حال
پوچھیے لیکن ذرا صبر و سکوں سے پوچھیے
سرکشی کا دیکھیے سرو و صنوبر کی ثمر
جھومنے کی وجہ شاخ سرنگوں سے پوچھیے
دہر ہے مانند قلزم آسمان مثل حباب
تھاہ کو پھر اس کی کیا گردون دوں سے پوچھیے
تا بلب آتا ہے نالہ کروٹیں لیتا ہوا
وجہ بیتابی کی لذت ارغنوں سے پوچھیے

۱۴ ——— دل ——— ۴۴۱

عشق خطا سی ہے سو الفت لب خاموش کی
بڑھتی ہی رہتی ہے گرمی آتش خس پوش کی
ہم نے اس ساماں سے لی کوچۂ قاتل کی راہ
بار گردن سر کیا گردن وبال دوش کی
کاسۂ سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے وہیں
ہر قدم پر جس جگہ محفل تھی نا و نوش کی
خاکدان دہر کے چھٹنے کی پروا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ یہ سمجھا گرد تھی پاپوش کی

قبر پر آیا بھی تو شوخی سے باز آیا نہ وہ
شمع مدفن گاہ روشن کی کبھی خاموش کی

دیکھ کر پھولوں پہ شبنم ہے یہ مستوں کو گماں
رال ساغر پر ٹپکتی ہے کسی مے نوش کی

کیا کمندِ زلف کم تھی قتلِ عالم کے لئے
اوس پہ یہ طرہ ہوا الٹو از زیبِ دوش کی

رنج دینا اس قدر مجھ سے رہا دست و بغل
وسعتِ عالم ہوئی تنگی مری آغوش کی

ہٹ نہ جائے آسماں اک دن گہر دندی کی طرح
اشک غم میں شوخیاں ہیں طفلِ بازی گوش کی

احتمال اب تو مکان کا لامکان پر ہو گیا
بڑھ گئی ہے اس قدر پرواز میرے ہوش کی

جاتے ہی منبر پہ واعظ آپ سے باہر نہ ہو
الحذر اے مہرباں کچھ حد بھی ہے اس جوش کی

تھا ساغر دور سے ساغر کے نکلے کس طرح
یہ نگاہ مست ہے ساقی کسی مے نوش کی

ہے بجائے خود کمالِ شوق بھی مشکل

تنگ آیا یار کا تنگی ہوئی آغوش کی

آرزوئے دل کو سن کر یہ فرماتے ہیں وہ
جی میں کیا اے نظم ہے باتیں کرو کچھ ہوش کی

۱۸۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

کیا کہیں کیونکر تمہے کیونکر چلے
مضطرب آئے یہاں مضطر چلے

غیر کے گھر اس طرف ہو کر چلے
مفت کا احسان مجھ پر دھر چلے

ضعف میں بھی ہو گئی طے راہ شوق
ہر جگہ گر گر اوٹھے اوٹھ کر چلے

کیا نگاہ آفت تھی کیا عشوہ تھا قہر
بزم میں چھریاں چلیں خنجر چلے

زیر گردوں زندگانی تھی پہاڑ
آفتیں جھیلیں مصیبت بھر چلے

ہو تواضع بھی مگر تمکیں کے ساتھ
چاہیے جھک کر ذرا رک کر چلے

سندس و قاقم کی بھی پروا نہ کر
جب تک اپنا گبر و استر سے چلے

کیا مزاج دہر کی اصلاح ہو
چار دن اپنی سی ہم بھی کر چلے

اُس کو پھر تیغ آزمائی کا ہے شوق
کیا ہوا اگر زخم میرے بھر چلے

سافیا ہم سب ہیں رند پاکباز
جادۂ تسلیم پر ساغر چلے

خاک ہو جاؤں تو پہنچوں اوڑ کے کاش
کچھ تو میرا زور گردوں پر چلے

قبر میں گھٹ گھٹ گئے یوں رہ جائیں ہم
ہائے یہ ٹھنڈی ہوا باہر چلے

وہ تو دل لیتے ہی بازی لے گیا
داؤ اپنا دیکھیے کیونکر چلے

کشتی مے لے کے ساقی جلد آ
جھومتے دریا پہ ابر تر چلے

۱۸۶ — ۲۱

تندیِ مے حیرت افزا ہو گئی
موجِ برقِ طور سینا ہو گئی

جب زبانِ حال گویا ہو گئی
بات خاموشی میں پیدا ہو گئی

دل میں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی
آنکھ تک پہنچی تو دریا ہو گئی

عیش کی رات اس قدر کوتاہ تھی
شام امشب صبحِ فردا ہو گئی

دب گیا گردِ کدورت میں جو دل
دفن ساتھ اس کے تمنا ہو گئی

آتشِ بے نار نفس سے یہ صدا
روحِ مرغِ رشتہ برپا ہو گئی

ضبطِ گریہ تجھ کو راس آتا نہیں
پھر کہاں تک آنکھ دل [illegible] ہو گئی

دل میں چھپنے سے برا آیا خیال
اور خبر عالم میں افشا ہو گئی

پھر تجھے انساں کو نظر آتا نہیں
آنکھ جب محوِ تماشا ہو گئی

ہاتھ رکھتے ہی دلِ بیمار پر
مضطرب نبضِ مسیحا ہو گئی

کچھ نشاں تجھ کو ملا اے خاکِ جم
تیری دولت کس نے لی کیا ہو گئی

پیرزن کے کلبۂ تاریک سے
روشنی طاقِ کسریٰ ہو گئی

چشمِ موسیٰ کو تھا ایسا شوقِ دید
اک نگہ برقِ تجلی ہو گئی

عشق کے اس شعبدہ کو دیکھنا
پھر جواں کیونکر زلیخا ہو گئی

دست و پا مارے کسی نے اب تو کیا
سر سے اونچی موجِ دریا ہو گئی

آگیا گلشن میں فرمانِ بہار
زلفِ سنبل خطِ طغرا ہو گئی

عشق بھی اک قوتِ اشرق ہے
دل سے دل میں راہ پیدا ہو گئی

وار پر کھینچو سزا اس کی یہ ہے
کیوں طبیعت ناشکیبا ہو گئی

دل میں تو نے جو چھپا رکھی ہے بات
وہ بھی چتون سے ہویدا ہو گئی

ہو گئی نانِ جویں سدِّ رمق
لیجیے آباد دنیا ہو گئی

نظم کھینچا تو نے دنیا سے جو ہاتھ
دیکھ ہر نعمت مہیا ہو گئی

۱۸۷ ——— دلہ ——— ۱۳

سجدے زنار کیوں کیسی کہی
زاہدِ عیار کیوں کیسی کہی

کٹ گئے اغیار کیوں کیسی کہی
چھا گئی ہر بار کیوں کیسی کہی

ہیں یہ سب اقرار جھوٹے یا نہیں
کیجیے اقرار کیوں کیسی کہی

روٹھنے سے آپ کا مطلب یہ ہے
اس کو آئے پیار کیوں کیسی کہی

کہہ دیا میں نے ترے جھوٹھ موٹ
ہو گئے بیدار کیوں کیسی کہی

ایک تو کہتے ہیں منہ بھتیاں
اور پھر اصرار کیوں کیسی کہی

ناصحا یہ بحث دیوانوں کے ساتھ
عقل کی ہے مار کیوں کیسی کہی

یا خفا تھے یا ذرا سی بات پر
ہو گئی بوچھار کیوں کیسی کہی

مجھ سے بیعت کرنے تو بھی داغ
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

سر ہو دے کر دل کے لینے کا ہی قصد / آنکھ تو کر چار کیوں کیسی کہی
جان دیدے چل کے در پر یار کے / او دل بیمار کیوں کیسی کہی
کیا ہی جھگڑے ہوتے ہیں بات پر / ہو گئے بیزار کیوں کیسی کہی

اب تو حیدر اور ہی کچھ رنگ ہیں
مانتا ہوں یار کیوں کیسی کہی

۱۸۸ ـــ فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ـــ ۱۷

ہیچ نظروں میں اگر عالم فانی ہو جائے / پھر یہی ہیچ مدانی ہمہ دانی ہو جائے
کشتی بادہ میں پیدا وہ روانی ہو جائے / رنگ بحر فلک آب بھی پانی ہو جائے
کاش دل کش مری آشفتہ بیانی ہو جائے / درد دل تو نہ مرا اس کی کہانی ہو جائے
دل اگر رہرو اقلیم معانی ہو جائے / مرتفع بعد مکانی و زمانی ہو جائے
خسرو عشق نے تیشہ کو وہ عزت دی ہے / سر فرہاد پہ جو تاج کیانی ہو جائے
جوش میں آئے اگر دل جو ہے اک قطرۂ خوں / گرم ہنگامۂ خونابہ فشانی ہو جائے
جائے عبرت ہے کہ یوں کوچ کرے لشکر گل / جرس قافلہ اک برگ خزانی ہو جائے
اک ذرا تشنگی شوق میں تاثیر ہے شرط / پھر جو خنجر کی طرف دیکھیے پانی ہو جائے
کبھی مرنے کا ہے مذکور کبھی حشر کا ذکر / پاس واعظ کے جو بیٹھے خفقانی ہو جائے
دہن زخم سے شکوؤں کے نکلتی ہے دعا / کہ زیادہ تب خنجر کی روانی ہو جائے
شکوہ ہجر جو کرتا ہوں تو ملتا ہے جواب / صبح ہو جلد نہیں ختم کہانی ہو جائے

کس قدر جوش ہی واعظ کہیں ایسا تو نہ ہو
صرف رندوں ہی پہ زورِ ہمہ دانی ہو جائے

گو ہر چند کجا اور کجا ناشنوا
دیکھ پتھر نہ سماعت کی گرانی ہو جائے

رشتہ در رشتہ جو ہی طولِ امل لطف ہو جب
صید اس دام میں طاؤس جوانی ہو جائے

چمنستاں میں عنادل کا ہوا ایسا تو ہجوم
شاخِ گل جو ہو وہ ارگن کی کمانی ہو جائے

ہاتھ میں لے کے عصا طور پہ آئے ہیں کلیم
آشکارا نہ کہیں حالِ شبانی ہو جائے

راہِ مولیٰ میں اگر نظم کو آجائے اجل
گردِ صحرائے نجف بردِ یمانی ہو جائے

۱۸۹ ——— ۱۲

وہ جو برہم ہیں تو بگڑی ہوئی تدبیر بھی ہے
مستعد لڑنے پہ مجھ سے مری تقدیر بھی ہے

دیکھیں اب ملتی ہے کیا داد ہمیں محشر میں
دل بھی قاتل بھی ہے پیکاں بھی ہے تیر بھی ہے

چاہے وہ قتل کرے چاہے مجھے قید کرے
سر بھی شمشیر بھی ہے پاؤں بھی زنجیر بھی ہے

منہ سے شکوہ تو میں کرتا نہیں خود دیکھ لیں آپ
دل میں اک زخم بھی ہے زخم میں اک تیر بھی ہے

دلِ مضطر کی اسیری کے ہیں ساماں کیا کیا
زلف و کاکل بھی ہے گیسوئے گرہ گیر بھی ہے

خونِ ناحق کو بھلا حشر میں مکرے تو سہی
تیغ و صیاد بھی فتراک بھی نخچیر بھی ہے

کس کو دیتا ہے خدا فتح و ظفر کس کو شکست
دیکھنا بختِ جواں بھی فلکِ پیر بھی ہے

ہم نے ان زہد فروشوں کو بہت دیکھا ہے
کچھ حقیقت بھی ہے کچھ حیلہ و تزویر بھی ہے

لے چکے جان اشارے مژہ و ابرو کے
کشتۂ تیغ بھی ہے دل ہدفِ تیر بھی ہے

آئینہ رکھ کے ہی منظور اسے آرائش بھی
اسی پردہ میں مگر قتل کی تدبیر بھی ہے

نہیں کھلتا سبب غفلت اہل عالم
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی تعبیر بھی ہے

چاہ کر تم کو گنہ گار رہو انظم حزیں
قابل قتل بھی ہو لائق تعزیر بھی ہے

۱۹۰ ——— ۱۶

لے کے ساغر سر و پا کا نہ رہا ہوش مجھے
کر دیا فکر دو عالم سے سبکدوش مجھے

ہو گیا دام کا خطرہ بھی فراموش مجھے
طبع رنگیں نے نہ رہنے دیا خاموش مجھے

میں نے کہتے ہوئے کعبہ کو سنا ہے اکثر
کر دیا داغ غم عالم نے سیہ پوش مجھے

بزم عشرت میں جو آجائے وہ مست اے ساقی
میں سنبھالوں اسے اتنا تو رہے ہوش مجھے

کہہ رہا ہے یہی نقش خط پیمانۂ جم
پی گئے گھول کے رندان قدح نوش مجھے

کھول کر میں گرہ زلف پشیماں ہوا
نظر آیا وہ ستمگار زرہ پوش مجھے

عہد پیری میں ہوا وہ شمع مزار حسرت
کہ نسیم سحری کر گئی خاموش مجھے

دیدہ و دل ہے پھر آج گہہ حیرانی
ہائے اے پیر مغاں آ گیا پھر ہوش مجھے

ہو جو ممکن تو رگ جاں میں گرہ دے رکھو
کہ تیری یاد نہ ہو جائے فراموش مجھے

عیش کی عمر ہے کوتاہ نہیں شک اس میں
شب گیسو میں ہوئی صبح بنا گوش مجھے

خوف یہ ہے کہیں دار اجل کا چل جائے
جھریاں کہتی ہیں پیری کی میں زرہ پوش مجھے

الفت مادری آخر تھی زمیں کو مجھ سے
کس محبت سے لیا کھول کے آغوش مجھے

اس کی رحمت کے میں صدقے کہ دیا زاہد — دل افسردہ تجھے خاطر پر جوش مجھے
بادشاہی تھی گدائی در میخانہ کی — کہ سلیماں کی طرح لیکے اوڑا ہوش مجھے
نقش حسرت ہوں کسی نے نہ کیا پیش چشم — حرف عبرت ہوں بنایا نہ در گوش مجھے

پرسش حشر سے اے نظم بچا لے گی ضرور
اوس کی درگاہ عطا پاش خطا پوش مجھے

۱۹۱ — ۵

دیکھے وہ زلف کہ یا قد رعنا دیکھے — جس کے آگے تو خراماں ہو وہ کیا کیا دیکھے
کس کو وہ دیکھے ترا جو رخ زیبا دیکھے — چاند یہ دیکھ کے پھر منہ نہ کسی کا دیکھے
کوئی کب تک دل ناداں کا تماشا دیکھے — روٹھ جانا ترا دیکھے کہ مچلنا دیکھے
خیر ناصح ہی اگر سحر بیاں ہوئے تو — میں سمجھنے کا نہیں وہ مجھے سمجھا دیکھے
شکوہ ظالم کا زباں سے تو نہیں کرنے کا — میں دکھاؤں جو کوئی میرا کلیجا دیکھے
دیر سے حور ہے ساغر بکف و عشوہ نما — آنکھ جس نے تری دیکھی ہو ادھر کیا دیکھے
میری بیتابی دل کی ہو اونہیں کیا پروا — جن نگاہوں نے وہ عالم تہ و بالا دیکھے
شام ہی سے غم فرقت میں ہے مرنا سب — کیوں جیے اتنا جو طول شب یلدا دیکھے
تھا کرشمہ یہ شب عیش کی کوتاہی کا — صبح اور شام کو یوں تو کوئی یکجا دیکھے
بدمزاجی کی بھی کچھ حد ہے الٰہی توبہ — چھیڑ دے کوئی ذرا اور تماشا دیکھے
زاہد خشک کو دعوی ہے شکیبائی کا — سامنے اس بت کافر کے ذرا آ دیکھے

جس کو منظور رسائی ہو ترے کوچہ تک
ہو جیسے مثل حباب ایک نگہ کی فرصت
چاہیے دہر میں وہ عاقبت اندیش نظر
جوش گریہ ہے علاج غم دیوانۂ عشق

کچھ دنوں کھائے ہوا دشت کی صحرا دیکھے
کھول کر آنکھ کو جاتی ہوئی دنیا دیکھے
جو کہ امروز کو آبستن فردا دیکھے
دل سنبھل جائے جو بہتا ہوا دریا دیکھے

۱۹۲ — وله — ۲۱

جلوہ کن عیبوں سے ترے فرمانے سے
سرکشی نفس کی ہے باعث بیتابی دل
آنکھ بھی ہو تماشا گری اک بجلی
عقدۂ سر حقیقت نہ ہوا حل اب تک
قید ہستی گرو سلسلۂ تار نفس
رولے جی بھر کے بہاروں سے نکل کر ناداں
تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفس بول
دیکھ کر جلوۂ جاناں میں ہوا گم ایسا
چشم بینا کو نظر آتے ہیں اسرار نہاں
سارا عالم مری نظروں میں ہے خورشید نما
دیکھ اک گھڑی کا جل کی ہنسانے دنی
زیست کا لطف گیا ساتھ دل زندہ کے

کیا کمی ہو گئی تمنا مری برلانے سے
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے
گتھیاں اور بھی پڑتی گئیں سلجھانے سے
زندگی ہوتی ہے زنجیر کے کھڑکانے سے
فائدہ کیا سر شوریدہ کے ٹکرانے سے
شعلے اوٹھنے لگے آخر ترے بھڑکانے سے
آپ کو پا نہ سکا آپ میں بھی آنے سے
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے
ذروں میں مہر کی تصویر اتر آنے سے
لے نجات ابدی پیچ کے نکل جانے سے
جل گیا نخل بھی اس پھول کے کھلانے سے

دے چکا بندے کو اب دو جہاں وہ پہلے
اصل قیمت کو سمجھ لیجئے پہچانے سے

اپنی دنیا تو بنا لی تھی ریاکاروں نے
مل گیا خلد بھی اللہ کو بہلانے سے

داورِ حشر گنہ گاروں سے پرسش کیسی
فائدہ قصۂ پارینہ کے دہرانے سے

اوس طرف عرش کے ہے منزلِ مقصود اپنی
رہ گیا میں کششِ ارض میں آجانے سے

دیکھ لی دیکھ لی نیت تری ہم نے ساقی
بادہ کم ہو تو نہ کچھ جام کے چھلکانے سے

آکے تو بیٹھ یہاں کام نہیں ناصح کا
میں سمجھ جاؤں گا سب کچھ ترے سمجھانے سے

کرسیٔ عدل کی اصغر نے بڑھا دی توقیر
داوری گاہ عدالت میں جگہ پانے سے

اوج پہ مجلسِ اعلیٰ کی سفارش سے ملا
اور سلطانِ حق آگاہ کے فرمانے سے

داد لیتا ہوں میں اے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے بحر کے لہرانے سے

۱۹۳

یاد تھے ہم کو بہت ذکر پریشانوں کے
سننے والے نہ رہے اب تو ان افسانوں کے

مسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے
بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے

گرد میں قافلۂ نکہتِ گل کی سمجھا
دیکھ کر رنگ [illegible] کو گلستانوں کے

آتش افروز ہوئی برق جو صدمے مطرب
نغمہ نے نہیں مشغلے میں ترانوں کے

بارِ خاطر تو نہ ہو جا کہیں اے طولِ امل
بس بچا دل میں کہیں تجھ سے ارمانوں کے

تتلیوں کا یہ تماشا تھا جو دیکھا ہم نے
ہاتھ پڑتے ہیں رکے سلسلے جنبانوں کے

قدرتِ نغمہ سے ہوتی نہیں زحمت محسوس ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے
بسملوں کو بھی تڑپتے نہیں دیکھا ایسا چاندنی شمع کی مقتل میں ہے پروانوں کے
لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھ کو پہرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے
ڈال دی بار پہ درد نے اون پر بھی کمند کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے
ہیں حوادث بھی زمانہ کے وہ اعجاز رقم نقش رہ جاتے ہیں ہر نخل میں طوفانوں کے
نخل آشوب سے اس ہفت فلک کے بچ کر کچھ بگولے ہیں سرِ راہ بیابانوں کے
آزمانے کو جو اپنا نہ زمانہ کی چلا دیو بھی مجھ کو ملے بھیس میں انسانوں کے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ارباب کمال حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے
خوانِ نعمت پہ ہجوم اہل ہوس کا ہے عبث من و سلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے
بحر موجوں سے گلا اپنا چھڑا کر نکلا رہ گئے دام جو بچھے تھے گریبانوں کے
جلد اے بادِ مراد آکہ ہے کشتی اپنی منہ میں گرداب کے آشوب میں طوفانوں کے
کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے
اوس کی محفل میں خبر کچھ دلِ مضطر کی نہیں لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا پروانوں کے
مجھ کو حیرت ہے کہ رخسار تو لو دیتے ہیں اور کھلاتے نہیں پھول کبھی کانوں کے
ہم نے بھی گوشۂ عزلت میں کیے ہیں وہ کام کارنامے جو تہمتن کے ہیں میدانوں کے
ایسے دروازہ کو بس دور سے ہی اپنا سلام جس جگہ ناز اٹھانے پڑیں دربانوں کے
ہیبتِ معدلتِ دولتِ عثمانی نے شیر میں لرزہ بر اندام نیستانوں کے

چاہیے عرش کے مضمون غزل میں نظم
ساتھ ہی اس کے مضامین پریشانوں کے

١٩٤

مجھ کو اے یار ذرا چشم نمائی ہوتی
دل تو مل جاتے جو آنکھیں لڑائی ہوتی

ہوئے کے مے پیر مغاں نے مجھے روکا ورنہ
داؤ پر دولت کونین لگائی ہوتی

راز ہے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہکو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

سامنے داور محشر کے کہتے پھر آپ
پہلے مجھ سے تو ذرا آنکھ ملائی ہوتی

ضبط کیا ہی دل نے جو بنایا تھا حصار
ایک آنسو نے وہ دیوار گرائی ہوتی

ہو تیر رشک میں جس طرح قفس میں بلبل
یہیں رہ جاتا تڑپ کر جو رہائی ہوتی

کوئی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

ٹوٹ جاتی جو یہ زنجیر تو اے دشت جنوں
شہر سے وادی وحشت میں بلائی ہوتی

توبہ جب کر چکے ہم ابر آیا ابھی تو کیا
لطف جب تھا کہ گھٹا آنکھوں میں چھائی ہوتی

وضع ہم خانہ بدوشوں کی بنا کر اے خضر
چھاونی عالم فانی میں چھائی ہوتی

روح غربت نہ گراتی نہ اگر حرص مجھے
آسماں کو ہوس ناصیہ سائی ہوتی

رشک خورشید رکا سا خیر ہوئی یہ ورنہ
اس پتنگے نے ابھی آگ لگائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تھے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید بر آئی ہوتی

حسن جو ہوتا ہی بندش میں وہ مضموں ہیں کہاں
بڑھ کی سونے سے ہی قیمت میں گھڑائی ہوتی

کاغذ باد رہا دست ہوس میں دل زار
اڑا ہو جاتا یہ ممکن جو چڑھائی ہوتی

گر پڑا پاؤں پہ کوئی تو کہا ٹھکرا کر
لوگ ہنستے تجھے ذرا شرم تو آئی ہوتی

تو نے احسان جو اٹھایا تھا کسی کا اے نظم
آنکھ پھر سامنے وہ کس کے نہ اوٹھائی ہوتی

۱۹۵ —— وله —— ۱۲

جان جاتی رہے شکوہ نہیں کرنے والے
کیا جگر رکھتے ہیں دم عشق کا بھرنے والے

پھیر تو لی ہے نگہ اس کی خبر ہی لینا
مل گئے خاک میں نظروں سے اترنے والے

مضطرب ہو نہ شب غم میں ستاروں تو دیکھ
کیسے خاموش گذرتے ہیں گذرنے والے

روح پھونکیں تن بیجاں میں کچھ آسان نہیں
کیا مسیحا بھی ہیں دم عشق کا بھرنے والے

کوئی موسیٰ کی طرح طالب دیدار تو ہو
اپنے عاشق سے وہ پردہ نہیں کرنے والے

آفتوں کا ہے یہ گھر دم بھی نہ لینے کو ٹھہر
اتنا وقفہ بھی مناسب نہیں مرنے والے

ایسے بیزار گئے لوگ جو دنیا سے گئی
اب ادھر بھول کے بھی رخ نہیں کرنے والے

نصرت حق جنہیں موسیٰ کی طرح ہی منظور
کسی فرعون سے ہرگز نہیں ڈرنے والے

طالب منزل مقصد ہی مرا اشتیاق
ساتھ لے لے مجھے رستہ سے گذرنے والے

موج خیز غم الفت کا تلاطم تو یہ
غوطے کھا جاتے ہیں پانی پہ ٹھہرنے والے

خون ناحق کہیں چھپ سکتا ہے ہم دیکھیں گے
حشر کے دن تو مکر جائیں مکرنے والے

زیست ذلت کی ہی مرجانے سے بدتر بخدا
کچھ خبر بھی ہے تجھے موت سے ڈرنے والے

۱۹۶ — وله — ۱۲

شمع خورشید ہی دامن بزم میں جلنے کیلئے
چرخ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کیلئے

غم ہے بے صبر کلیجہ مرا ملنے کیلئے
اشک بیتاب ہیں آنکھوں سے نکلنے کے لئے

پاؤں بہکا تھا اگر نشہ میں بہکی نہ زباں
نام ساقی کا لیا گر کے سنبھلنے کیلئے

موت ہی نے شب ہجراں میں بہت کی تاخیر
ہم تو بیٹھے تھے بڑی دیر سے چلنے کیلئے

اتنا اطلس کی قبا پر نہو نازاں طاؤس
پائے نازک بھی تو موزوں نہیں چلنے کیلئے

یہ سمجھ کر سرِ رہ ہم نے بنایا ہے مزار
تم کبھی تو نکل آؤ گے ٹہلنے کیلئے

سہہ کے ایذا دلِ ناداں کو بنا لے پتھر
کام آئے گا یہ موذی کو کچلنے کیلئے

دل لگایا ہے تو آنسو نہ بہاؤں کیونکر
نخل کو سینچتے ہیں پھولنے پھلنے کیلئے

پوچھیے دشمن سے کوئی میرے قلم کا انداز
ہے یہ اردو زباں زہر اگلنے کیلئے

دل ہو بیتاب تو یارب ہے یہ طاقت مجھ میں
دونوں ہاتھوں سے کلیجے کو مسلنے کیلئے

دامنِ یار تلک ہاتھ نہ پہنچا نہ سہی
دل تو پہلو میں ہے سو ہاتھ اچھلنے کیلئے

ہے یہ بالوں کی سفیدی خبر مرگ ای نظمؔ
دھوپ دیوار پہ چڑھتی ہے تو ڈھلنے کیلئے

۱۹۷ — وله — ۱۱

کہنیوں تک مرے بہہ کے لہو آتا ہے
کیا نہیں آتا ہے کافر کو وضو آتا ہے

اوس کو جو کوٹھی پہ دیکھا ہی تو ہی دل کا یہ حال
جب اوچھلتا ہے لب بام کو چھو آتا ہے

نشۂ مئی سے ہے لغزش قدم ساقی میں
جھونکے لیتا ہوا محفل میں سبو آتا ہے

کوئی پوچھے تو سہی قتل کیا ہے کس کو
منہ چھپائے ہوئے وہ عربدہ جو آتا ہے

قبر میں بہر خدا چین سے سووں کہ نہیں
ہے ستم ساتھ جنازہ کی بھی تو تم آتا ہے

ہیں کدہر رند ذرا جھوم کے چلنا دیکھیں
ابر کہسار سے اوٹھ کر لب جو آتا ہے

بس نہ دیوانے پہ چلتا ہے نہ ہشیار پہ کچھ
نہ تو دل آتا ہے قابو میں نہ تو آتا ہے

کھل گیا اتنو کہ دل میں ہے خلش تیرنگا کی
خون اشکوں میں بقدر سر مو آتا ہے

زمزمہ تیرا کس آفت کا تھا ای مرغ چمن
آج گلزار میں غنچہ کے لہو آتا ہے

لاش بسمل پہ جو ہے اشک فشانی منظور
بال کھولے ہوئے وہ غالیہ مو آتا ہے

نظم اغیار سے کیا قدر شناسی کی امید
کہیں نا کس کو خیال کس و کو آتا ہے

۱۹۸ —— ولہ —— ۳۲

نہ مروت نہ مدارا نہ وفا آتی ہے
ظلم آتا ہے ستمگر کو جفا آتی ہے

مژدۂ عیش لیے باد صبا آتی ہے
ساغر گل میں مئے ہوش ربا آتی ہے

اونگلیاں کانوں میں رکھئے تو صدا آتی ہے
شور کرتی ہوئی اک سیل فنا آتی ہے

راستی میں قافلۂ عمر ہے سرگرم سفر
دل دھڑکتا ہی تو آواز درا آتی ہے

شک گذرتا ہے برہمن کی طہارت میں اگر
ایک غم مدغم صہبا میں لگا آتی ہے

۲۱۵ ہمت کا مصرعہ ۱... ۲۱ ہوفت کے قمار سے باقہ : ہے د

گل نے کیا جانے سنی بانی ہے کس کی آواز
کان بجتے ہیں ابھی تک وہ صدا آتی ہے

اے صبا سیرِ گلستان میں مستانہ روی
تو قرا ہے گل و نسرین کی لنڈھا آتی ہے

موسمِ گل میں ہے جامہ میں سماتا گل
ٹھیک آتا ہے گریبانِ قبا آتی ہے

شنوا ہو تو کوئی شوق تو ہو منزل کا
سیکڑوں کوس سے آوازِ درا آتی ہے

دشتِ غربت سے لیلیٰ کا عجب تھا ہے خیال
سامنے حیرتِ نقشِ کفِ پا آتی ہے

منزلِ گور ہے اس دشت کی پہلی منزل
دل کے آ جانے سے پہلے ہی قضا آتی ہے

دم جو لیتا ہے ذرا کوہ کنی میں فرہاد
جا کے شیریں اسے آواز سنا آتی ہے

خلوتِ وصل میں آ جائیگی ہو جرأت کس کو
آتی ہے شرم بھی تو رو تبعاً آتی ہے

اس کا دم بھرتے ہیں بیٹھے ہوئے دنیا سے الگ
ہر نفس میں خبرِ ارض و سما آتی ہے

خود تو مخمور ہے اوروں کو نصیحت زاہد
کچھ تجھے شرم بھی اے مردِ خدا آتی ہے

لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانہ پر
جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدۂ شکر
جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

وہ چلا گورِ غریباں کو خدا خیر کرے
تو قیامت بر خاکِ شہدا آتی ہے

دل تڑپا میں شبِ فرقت میں رہ صبح تلک
اس کہانی میں کہیں نیند بھلا آتی ہے

آہ کے ساتھ نکلتا ہے جو کچھ دل کا غبار
جا کے گردوں پہ بھی وہ خاک اُڑا آتی ہے

نہ تھمی عمرِ رواں لاکھ پھڑکتا رہا دل
سچ کہا ہے کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

راحتیں وادیٔ غربت میں بھی تو نے بخشیں
چھاؤں ہے سبزہ ہے جنگل کی ہوا آتی ہے

آنکھ جب پڑتی ہے دنیا پہ تو بڑھتی ہے ہوس
جب دریچہ کوئی کھلتا ہے ہوا آتی ہے

ہائے یہ قبر کی گرمی یہ اندھیرا ہے ہے
کوئی کھلتا ہے نہ روزن نہ ہوا آتی ہے

کچھ دنوں تخت سلیماں تھا ہوا پر اب تو
خاک اوڑانے کو سلیماں کی ہوا آتی ہے

خاک میری ہوئی برباد تو ہو جانے دے
میں تو خوش ہوں تیرے دامن کی ہوا آتی ہے

ہاتھ باندھے ہوئے آئینہ کھڑا رہتا ہے
پاؤں پڑنے کے لئے آپ حنا آتی ہے

چھیڑ کرتا ہے یہ ابرو کہ پڑے گی تلوار
کہہ رہا ہے یہی گیسو کہ بلا آتی ہے

وصل کی رات بھی یہ ہی ہے لڑائی اکثر
بار ہا بیچ میں وہ زلف دوتا آتی ہے

یہ تیوری چڑھ جاتی ہے فوراً یہ تماشا دیکھو
فتنوں سے جو ہنسی اوس کو ذرا آتی ہے

چاند نکلا کرے بڑھ بڑھ کے نکلتا ہے اگر
کہیں اوس میں ترے عارض کی صفا آتی ہے

نظم آزاد ہے اب اور ہے کنج خلوت
یاد ہر صبح نہ جاناں نہ صبا آتی ہے

١٩٩ ——— ولہ ——— ٢١

پاک کمر اشک نہ لے شاہد خوش خو میرے
ہاتھ نازک ہیں ترے گرم ہیں آنسو میرے

ناصحا رونے سے آزردہ رہا تو میرے
رہ کے تسکین نہ پونچھے کبھی آنسو میرے

برچھیاں مارگی اور درد جگر چاک نہ کر
درد وارد ہے جو شوق میں پہلو میرے

عہد طفلی سے جو ہیں سر پہ بلائیں نازل
جانتا ہوں کہ یہ لٹکے ہیں گیسو میرے

درد و اندوہ سے پڑتی ہی رہی چین و شکن
غم کے ہاتھوں میں کماں دار ہے ابرو میرے

ہاتھ سے ہے پیری اشک گئے پاک اُس نے
پھلیاں موتیوں کی ہو گئے آنسو میرے

پاؤں جھولے سے نکالا ہے کہ سودا الٹا
عشق لیلیٰ بچپن کے شگوفے ہوئے گھنگرو میرے

اوس طرف لی کبھی کروٹ تو کبھی اُس جانب
ڈھونڈتے ہیں کسی محبوب کو پہلو میرے

ہیں گلے ہار جو کسی مہرلقا کے بانہیں
آج شاخ گل خورشید ہیں بازو میرے

جب میں جانوں کہ ہوئی یکدلی و ہمدردی
اون کی آنکھوں سے نکلنے لگیں آنسو میرے

جب بڑھی دست دعا جانب ساقی ازل
بھر گئے بادۂ مقصود سے چلو میرے

جان لیں پہچان نہیں گوشۂ عزلت میں کوئی
روشناسوں میں ہیں آئینہ زانو میرے

دل کو تو لے تو مرے حسرت دیدار ذرا
روشنی طور کی دیں سنگ ترازو میرے

آگیا حال مجھے حضرت موسیٰ کی طرح
آکے چمکا جو کبھی سامنے جگنو میرے

آج پر جوش ہے پر شور ہے میتا ہی دل
یہ سبب ہے کہ تلاطم میں ہیں آنسو میرے

سوز غم سے کسی کروٹ نہیں پایا آرام
مثل فانوس خیالی ہے پہلو میرے

کلفت افسوس ہی دل میں کیا کام تمام
خون امید سے لبریز ہیں چلو میرے

ہوا ہی کیا گرہ زلف جو کھل جائے گا
کوئی مضموں ہیں کہ بندھ جائیں گے بازو میرے

دیکھ کر تاروں کو یاد آتی ہے بزم شب عیش
صبح تک شام سے تھمتے نہیں آنسو میرے

کیا بیاں کیجیے بالوں کی سفیدی کا فروغ
عہد پیری میں ہوئے ابرو میرے

نظم اس بزم میں ہیں شاعر صاحب دل ہو بیا
دل کے خالی نہیں مصرع کے بھی پہلو میرے

رنگ خوں اشک میں گہرا نظر آتا ہی مجھے
پیر خطر عشق کا صحرا نظر آتا ہی مجھے
بندہ اوس زلف میں الجھا نظر آتا ہی مجھے
نظر عاقبت اندیش اک آئینہ ہے
نہ فلک دیکھ سکا اے مہ کامل وہ فروغ
زال و سیمرغ کا مذکور اک افسانہ ہے
خیال کیا ہوئیں اوٹھانہ بانداز حجاب
اس کی رحمت کا ہی جوش اپنے گناہوں کا ہجوم
کچھ عجب حال ہے دیکھی ہی اوسکی تصویر
کشتی بادہ لگا دے لب جو اے ساقی
غیر آنکھوں میں اوڑا لے گیا نقشہ تیرا
ساغر مے کے سوا او نہیں اسکا علاج
آج وہ اوڑھ کے لنگی میں دوپٹہ آبی
بیخودی کو مری کافی ہے یہ اے موسیٰ
جستجو میں تری او دشت میں پھرتا ہوں میں
چشم و مژگاں کا تصور ہی جنوں کا ساماں

آج دامن پہ کلیجا نظر آتا ہے مجھے
خضر اس دشت میں پیاسا نظر آتا ہی مجھے
دہن یار کا چھالا نظر آتا ہی مجھے
شکل امروز میں فردا نظر آتا ہی مجھے
ترا نہ صبح سی اترا نظر آتا ہے مجھے
دوست اس عہد میں عنقا نظر آتا ہی مجھے
ہے یہ پردہ ترا گہرا نظر آتا ہے مجھے
ایک سیلاب دریا نظر آتا ہے مجھے
تہ اندھیرا نہ اوجالا نظر آتا ہے مجھے
آج کے ابر میں دریا نظر آتا ہے مجھے
جب سے چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے
دل قتیل غم فردا نظر آتا ہی مجھے
آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہی مجھے
کوہ پر لالہ صحرا نظر آتا ہے مجھے
ز فلک آبلہ پا نظر آتا ہے مجھے
ان جگروں سے تو صحرا نظر آتا ہے مجھے

بندگی دیدہ حیراں نے پری شیشہ میں
ایک آفت کا یہ پتلا نظر آتا ہے مجھے

سن نہ لے وہ نقش پا زمیں کی آواز
جان دینے میں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے

ور مقصود کا کیا خوب شگون تہ آیا
کف افسوس میں چھالا نظر آتا ہے مجھے

دعوی جوشن صفا اور تمہارے آگے
آئینہ آنکھ کا اندھا نظر آتا ہے مجھے

حسرت دید سے جاں آ جو گئی آنکھوں میں
دم نکلنے کا تماشا نظر آتا ہے مجھے

داغ کو کیوں نہ کلیجہ سے لگائے رکھوں
ایک دل سوز تو اپنا نظر آتا ہے مجھے

اے غم یار لہو پینا سکھانے والے
دل میں کچھ خون تمنا نظر آتا ہے مجھے

شہرہ ہی شہرہ ہے ہستی کا یہاں نام ہی نام
بیضۂ رخ میں عنقا نظر آتا ہے مجھے

جس جگہ مہر نبوت نے شرف پایا ہے
آپ کا نقش کف پا نظر آتا ہے مجھے

ناز انداز ستم عشوہ کرشمہ حیدر
جو ہے وہ خون کا پیاسا نظر آتا ہے مجھے

۲۰۱ —— فعلاتن فعلاتن فعلن —— ۱۲

حسن پر خلق خدا لوٹ گئی
وہ ادا کی کہ قضا لوٹ گئی

چال پر اس کی قیامت اٹھ کر
مثل نقش کف پا لوٹ گئی

درد کی طرح اٹھا میرا غبار
دو قدم چل کے ہوا لوٹ گئی

سیکھے ہم سے کوئی انداز سوال
عرش پر جا کے دعا لوٹ گئی

بعد میرے کوئی پرساں نہ ہوا
قبر پر آ کے وفا لوٹ گئی

دیکھنا وار ادا کا اوس کی | ساتھ بسمل کے قضا لوٹ گئی
وہ جو مستانہ چمن سے گذرا | شاخ گل موج صبا لوٹ گئی
دیکھنا جذب دل زار مرا | کشمش کا ہر با لوٹ گئی
واہ رے حسن برو دوش و کمر | دیکھ کر زلف دوتا لوٹ گئی
چھاؤں آئی ترے کوچہ میں کہ دھوپ | خاک پر مثل ہما لوٹ گئی
چاندنی تا سر دیوار آکر | دیکھ کر جوش صفا لوٹ گئی

آج سن کر ترے نالے اے نظم
بلبل نغمہ سرا لوٹ گئی

۲۰۲ — مفاعلن فاعلن فعولن دوبار — ۲۲

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو دہر دارالاماں نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانہ یہاں نہیں ہے
وہ عندلیب اسیر ہوں میں یہی کہ اذن فغاں نہیں ہے
قفس میں نقش و نگار کیا ہوں نفس ابھی خونچکاں نہیں ہے
کبھی نہ کیں میں نے دل سے باتیں کہ یہ مرا راز داں نہیں ہے
نہ حرف مطلب زباں تک آیا کہ یہ مری ہمزباں نہیں ہے
یہاں سے ہے جانے کا نام آنا فریب میں دیکھ آنہ جانا
طلسم ہے رہ گزار ہستی غبار ہو کاروان نہیں ہے

نہ جذب وہ کہربا میں پایا نہ رنگ وہ پیسا خامیں پایا
کہاں کہاں میں نے جاکے ڈھونڈا دل و جگر کا نشاں نہیں ہے

نجانے ضبطِ فغاں نے کیونکر غمِ دروں کو چھپا کے رکھا
حریرِ رنگِ پریدہ میں تو کہیں وہ شعلہ نہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبح عہدِ پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

نہ کوئی اعلیٰ نہ کوئی ادنیٰ کہ ہے مساوات ان کا مذہب
جہاں کے ہم سب ہیں رہنے والے زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثباتِ عالم ٹھہر کوئی دم تو اے شبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

کمندِ فکرِ بلند سے جب فضائے خاطر کو ناپتا ہوں
تو کہتی ہے شانِ لاتناہی کہ اس کی حد لامکاں نہیں ہے

سہیل و شعریٰ و نسرِ طائر میں خط ساغر میں ڈھونڈ لیتا
اگر یہ پیرِ مغاں نہ کہتا کہ یہ خطِ کہکشاں نہیں ہے

برا جو کتنا ہی کہہ لے واعظ برا نہ مانیں گے رند ہرگز
کسی سے دل میں ملال رکھنا یہ رسمِ دیرِ مغاں نہیں ہے

چمن میں آکر یہ میں نے جانا ہے اتفاق اصل شادمانی

یہ دو ہوائیں بھی ہیں مل کر یہ نہر آب رواں نہیں ہے

کمند موج شعاع پا کر چلی سوئے اوج مہر شبنم
سپند رہ رہ گیا تڑپ کر کہ درد دل نذر دہاں نہیں ہے

یہی تو ہے اس کا آستانہ نہیں بہت دور ہم کو جانا
وہ سامنے لامکاں نہیں ہے وہ حلقہ کہکشاں نہیں ہے

جھلک دکھادی تھی کس نے اپنی کہ جوہروں میں تھا اک تلاطم
فضائے آئینہ ہے او داس اب وہ طوطی پر فشاں نہیں ہے

نہ اف کرو تماشا کی دیکھو چھری جگر پر لگے تو دیکھو
مجھے ملال ستم نہیں ہے مجھے مجال فغاں نہیں ہے

نگاہ آبستن ہوس ہے۔ ہوس ہے آلودہ مناہی
تو اس سے بہتر ہے کم نگاہی کہ کچھ تماشا یہاں نہیں ہے

ہلاک ہونی کو اے مسافر چلا شب تار میں کدھر تو
کہ غول صحرا کے شعبدے ہیں یہ آتش کارواں نہیں ہے

بھلا ہو ناداں واعظوں کا کہ میکدے کو کیا ہے رسوا
وگرنہ بادہ کشی کا چرچا کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے

مقام تسلیم میں پہنچ کر۔ اثر نہ خوف و رجا کا دیکھا
سنا یہ کرتے تھے واعظوں سے بہشت میں دیو خوف یاں نہیں ہے

یہ کیسی اے نظم چپ لگی ہے کہیں نہ رسوا کرے یہ تجھ کو
کوئی خموشی نہ ہوگی ایسی کہ جس میں کچھ داستاں نہیں ہے

۲۰۳ مفاعیلن مفاعیلن فعولن ۳۲

پھرا ساقی کس آب آتشیں سے — کہ چھلکا خون رنگ یاسمیں سے
یہ کاوش خار صحرا اور یہیں سے — چھٹا دامن تو الجھا آستیں سے
فلک شرما گیا اس کی جبیں سے — بنائے چاند زلف عنبریں سے
کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر — اجازت لو نگاہ شرمگیں سے
فلک دیتا رہا سرمایۂ دہر — نہ اپنا ہاتھ نکلا آستیں سے
کشیدہ رہ نہ یوں اے دامن یار — لٹکنا سیکھ زلف عنبریں سے
مبارک تم بسمل ہو کے مرنا — چھری پھرتی ہے دست نازنیں سے
قصاص آخر لیا قاتل سے میں نے — اسے مارا نگاہ واپسیں سے
سفر کا میرے قصہ مختصر ہے — کہیں جانا ہے آیا ہوں کہیں سے
بہت نازک ہے اے ناصح مرا دل — کہیں ٹوٹے نہ حرف دل نشیں سے
پلٹ جاتا ہے فوراً بات کہہ کر — یہ عادت سیکھ لی ہمنے نگیں سے
تبسم کس خوں گرفتہ پر غضب تھا — لہو ٹپکا نگاہ خشمگیں سے
سبب گردوں کے خم ہونے کا یہ ہے — کہ جھک کر توڑتا ہے زمیں سے
شرار عشق دامن جل کے بھڑکا — چراغ عقل گل کر آستیں سے

خوشی میں بھی نکالے غم کے پہلو
خدا سمجھے دل اندوہ گیں سے

اٹھائی آنکھ اس نے اور نہ دیکھا
نہ سنبھلا جام دست نازنیں سے

یہ شاخ گل ہے اے بلبل کہ صیاد
کماں لے کر نکل آیا کمیں سے

بھلا محشر میں کیا واعظ سے امید
گنہ گار اس نے ٹھہرایا یہیں سے

کھلا یہ سابقہ کے بعد ناصح
کہ حضرت آپ بھی ہیں کچھ یونہیں سے

سخن جب اصل ہی میں بے نمک ہو
تو کیا ہوتا ہے شور آفریں سے

عطائی دہر سے یوں ہاتھ کھینچا
شکن نکلی نہ اپنی آستیں سے

کہا میں نے قیامت ہو تو بولے
یہ مردہ کیا نکل آیا زمیں سے

عجب آزاد ہے دیوانۂ عشق
نہ دنیا سے غرض اوس کو نہ دیں سے

تری قربت کا اک زینہ ہے معراج
وہ منزل دور ہے عرش بریں سے

اشارہ تیری رحمت کا اگر ہو
لڑوں کشتی کراماً کاتبیں سے

وہیں ہو خار زار اے چرخ افسوس
چمن پیدا ہوئے جس سرزمیں سے

بلا انگیز ہے خال رخ یار
زحل اوترا ہے چرخ ہفتمیں سے

خیال خال باندھا دل میں میں نے
ستارہ دیکھتا ہوں دوربیں سے

بیاں کس کو خبر دور فلک کی
کسے فرصت ہے دور ساتگیں سے

تعلی اہل رفعت نے نہ چھوڑی
گئی گردوں پہ خاک اوڑ کر زمیں سے

نگاہ مست نے رسوا کیا ہے
اوٹھا طوفان موج ساتگیں سے

جلائے نظم آئینہ پر اپنے
ہوئی گرد نگاہِ عیب بیں سے

۲۰۴ —— ۲۴

خیالِ چشمِ فتاں ہر گھڑی ہے
اجل سچ کہتے ہیں سر پر کھڑی ہے

لبِ اوس کا پھول کی اک پنکھڑی ہے
گراں جس پر کہ مسی کی دھڑی ہے

چلو صحرا کو یہ دھن ہر گھڑی ہے
یہی تدبیر مجھ کو بن پڑی ہے

یہ غرہ زلف و رخ پر یاد رکھنا
کبھی کا دن کبھی کی شب بڑی ہے

نہیں رنگِ چمن کو پائیداری
یہ سمجھو فصلِ گل اک پھلجھڑی ہے

دلِ غمگیں مرا وہ کربلا ہے
کہ لاشِ آرزو جس میں گڑی ہے

نظر کیا جانے شوخی اوس ادا کی
کہ یہ تلوار تو دل پر پڑی ہے

گھلا جاتا ہوں میں غم ہو کسی کو
کوئی پوچھے کہ تجھ کو کیا پڑی ہے

لحد تک پھر تو ہے پیری ہی پیری
غنیمت ہے جوانی جو گھڑی ہے

مجھے مارا تری اس نازکی نے
سروہی جب پڑی اوچھی پڑی ہے

وہ آئے نزع میں بالیں پہ میری
یہ ساعت نیک ہے اچھی گھڑی ہے

یونہیں رہنے دو مجھ کو نیم بسمل
تمہاری دل لگی تو دو گھڑی ہے

بھلا تم اور چراؤ دل کسی کا
سراسر جھوٹ ہے اور دھڑی ہے

ملے جائیں یہ منہ مانگی مرادیں
کہ بندوں پر تری رحمت بڑی ہے

شہنشاہوں سے بگڑا رہتا ہے وہ — جسے تیری فقیری بن پڑی ہے
الٰہی تو دل بے آرزو دے — مجھے حسرت میں حسرت یہ بڑی ہے
مرے پاس آتے آتے رک رہے وہ — اسی سے سانس سینہ میں اڑی ہے
جہالت میں سلوکِ راہ عرفاں — اندھیری رات ہے منزل کڑی ہے
میں پہلی ہی اسیری سے تھا سمجھا — کہ پا با عاشقی کا ہتکڑی ہے
نکالیں تو قدم وہ گھر سے باہر — قیامت ہاتھ باندھے ہی کھڑی ہے
متاعِ صبر پھونکی سوزِ غم نے — یہ چنگاری کہاں جا کر پڑی ہے
گنا ہونگی گھٹائے جائیں گے سایہ — سنا ہے دھوپ محشر کی کڑی ہے
نہ ہو بیزار مجھ سے تو تو اے قبر — مری صورت گلی ہے یا سڑی ہے

وفا کہتی ہے اب حیدر نکل جا
ادا کہتی ہے ایسی کیا پڑی ہے

۲۰۵ — ۱۹

وہ آئی فوجِ گل وہ برق چمکی — وہ اڑتی آتی ہے بیرق علم کی
مجھے خواہش ہے ساقی جامِ جم کی — بھلا ہو خیر تیرے دم قدم کی
یہ کہتی ہے صفِ مژگاں صنم کی — کہ راہیں بند ہیں دیر و حرم کی
نہ دیکھے اے نقشِ پا اون شوخوں کو — تری آنکھوں میں خاک اسکے قدم کی
فلک نے کھلا رکھا ہے لالہ و گل — یہ لاشیں ہیں شہیدانِ ستم کی

سمجھ لے ہاتھ پھیلانے سے پہلے ‏ | چلیں گی برچھیاں لاؤ نعم کی
مجھے غش میں پڑا رہنا ہے بہتر | ہوا ہے گرم دامانِ کرم کی
ہمارے دور میں بھی ہے وہی جام | خرابی کی ہے جس نے ملکِ جم کی
جو میری طرح سے کھینچا دمِ سرد | تو سانس اکھڑی نسیمِ صبحدم کی
نہ کیوں قسمت پہ اپنی ہوں میں نازاں | کہ گنجائش نہیں ہے بیش و کم کی
نہ رکھنا زیست میں دم کا بھروسا | کسی نے کیا وصیت مرتے دم کی
وطن کو مڑ کے غربت میں جو دیکھا | تو اک زنجیر تھی نقشِ قدم کی
یہ دل ہے اور تیری عشق کا داغ | قسم ہے مجھ کو قندیلِ حرم کی
عطا چھٹ جائے تو چھٹ جائے لیکن | ادا چھٹتی نہیں اہلِ کرم کی
رہائی دامِ گیسو سے ہوئی یوں | چھٹیں قفسیں اسیرانِ ستم کی
وہ دل آفت زدہ وہ کوچۂ زلف | وہ تاریکی وہ راہیں پیچ و خم کی
گریباں تک نہ پہنچا ہاتھ اس کے | پشیماں ہو کے بھی گردن نہ خم کی
ضرور اب اعتبار آئے گا سب کو | قسم کھائے ہیں وہ جھوٹی قسم کی

حذر لازم ہے بدگویوں کو اے نظم
کہ ہے کالی زباں میرے قلم کی

۲۰۶ —— غزل مشاعرۂ یمین السلطنۃ ذوالوزارتین دولت آصفیہ ——

چہ سامانِ سیہ کاری نہ کردی | ولے کردی و پنداری نہ کردی

درین گلشن بسانِ نکہتِ گل | ز خود رفتی و خود داری نہ کردی
ورش از سجدۂ تو دور تر بود | باندازہ نگوں سازی نہ کردی
سرت بار معاصی بر نتابد | چرا فکرِ سبکباری نہ کردی
خلاف از آبروے عشق آریں پس | چو بر رخ اشک غم جاری نہ کردی
ازیں خوابِ گران غفلت آوے | تو گاہے قصدِ بیداری نہ کردی
برین عقلِ تو واغطا آفریں است | کہ غم خوردی و غمخواری نہ کردی
من از تو ایں سخن باور نہ دارم | کہ دل بروی و دل آزاری کردی
چرا کے بندہ کہ رازِ عشق را فاش | تو و زمستی و ہشیاری نہ کردی
خدا کے بندہ کہ درایں کوچۂ عشق | لحاظِ ذلت و خواری نہ کردی
شدہ راز عطایت فاش نے شاد | کہ پنہانش ز بسیاری نہ کردی

خدا بودہ است آمرزندہ اے نظم
نہ کردی ہیش او زاری نہ کردی

۱۴ مفاعیلن چار بار ۲۰۷

نہ جی بہلا مرا بوئے گل و رنگ گلستاں سے
رہا آوارہ مثلِ گرد باد اٹھ کر بیاباں سے
نگہ بے باک بکھری کا کلیں سر کا ہوا آنچل
ترانا اس طرح آنکھ آئینہ کی یہ چشمِ حیراں سے

غلامی کرکے شاہی مصر کی پائی تو کیا پائی
نہ یوسف کو مناسب تھا نکلنا چاہِ کنعاں سے

ہوا سے کھل رہے ہیں پھول یہ ماجرا دیکھا
کہ جاتے ہی ترے اوٹھنے لگے شعلے گلستاں سے

تڑپنا تجھ میں نہیں اے آہ گرنا دیکھ بجلی کا
اثر تجھ میں نہیں اے درد اوٹھنا سیکھ طوفاں سے

جہاں فانی ہے لیکن ہے دلیل ہستی باقی
وجودِ سایہ ہو جس طرح خورشیدِ درخشاں سے

ہوا دل غم سے چور اضطراب اب بھی نہیں جاتا
بچانا شیشۂ ناموس یارب سنگ لرزاں سے

مجھے نشو و نمائے تختۂ سوسن کا شک گزرا
وہ اک پرواز تھی طاؤس کی صحنِ گلستاں سے

عجب کیا نرگسِ بیمار کی آنکھوں میں نور آئے
یہ بادل ہے کہ سرمہ اوڑ کے آیا ہے صفاہاں سے

میں اہلِ ہوش کی اس چارہ سازی کا ہوں دیوانہ
بنائیں طوق اوسے گھٹتا ہو دم جس کا گریباں سے

ادب کا ہے تقاضا تم میرے باندھے کوئی

انہیں غرہ ہے الجھ پڑنے کی ناصح کے گریباں سے

نگاہِ غور کی جس شخص نے اپنی حقیقت پر
تو شرما کر نہ پھر اس نے اٹھایا سر گریباں سے

بسانِ سیل ہم قطعِ تعلق کرتے رہتے ہیں
بہ شکلِ موج گر پیدا گریباں ہو گریباں سے

پلا پھر نظم کو جامِ جنوں انگیز اے ساقی
کہ دردِ سر ہو خمیازۂ چاک گریباں سے

۲۰۸ ولہ ۱۷

نہ اب نکلوں گا ساری عمر کوئے مے پرستاں سے
کہ دیکھی میں نے ہمدردی یہیں انساں کو انساں سے

ملا ہے گل فشانی کا سبق مجھ کو گلستاں سے
گہر ریزی مرے خامہ نے سیکھی ابرِ نیساں سے

ہر اک ذرہ یہ چشمک جھانک کر روزن سے کرتا ہے
کہ میں واقف ہوں تحلیلِ شعاعِ مہرِ تاباں سے

سماں اب تک شبِ عشرت کا پھرتا ہے نگاہوں میں
نکل آنے کو تھی سلمائے فطرت خود شبستاں سے

غلط ہے اس سرا میں راحلۂ ہستی کا کب ٹھہرا

مگر ہاں کچھ پتا ملتا ہے اس کا گرد جولاں سے
اثر تا عرش پہنچا اک نگاہِ حسرت آگیں کا

تلاطم پڑ گیا ہے جنبشِ دامانِ مژگاں سے
نہ انسان کبھی ممنونِ منت ایسے ویسوں کا

زمیں میں گڑ گیا ہوں میں فلک کے بارِ احساں سے
کئے دیتی ہے بیخود دیکھ گل ہاتھوں میں رشتہ ہے

سنبھل اے باغباں گرنے نہ پائیں پھول داماں سے
شکستِ مدعا کا سامنا ہے دونوں جانب سے

کسی کا دل ہے نازک تر کسی کے عہد و پیماں سے
رخِ روشن پر اک خالِ سیہ میں دیکھ کر سمجھا

عروجِ ماہ میں اترا یہ تارا اوج کیواں سے
پتہ ملتا نہیں راتوں کو اب خوابِ رمیدہ کا

غرض کیا طائرِ شبگرد کو فکرِ شبستاں سے
و راہِ کرم سے راہ چلتے فیض پاتے ہیں

صبا اکثر معطر ہو کے نکلی ہے گلستاں سے
ٹھکانہ اور بھی کوئی ہے کیا خانہ بدوشوں کا

گزر جاتا ہے دیکھیں گردِ باد اوٹھ کر بیاباں سے

غبارِ رہ گذر سے رہروؤں کا ماجرا سن لو
خبر اوڑتی ہوتی آئی ہے کچھ شہرِ خموشاں سے
مجھے بے صبر کیوں کیئے خطا یہ اشک خونیں کی ہے
کہ عادت ہے ٹپک پڑنے کی اوس کو نوکِ مژگاں سے
صدف کا سا جگر رکھو تو ہو آبستنِ گوہر
شکایت سنگریزوں کو عبث ہے ابرِ نیساں سے
زباں کج مج ہے اور دعوی ہے رنگیں خیالی کا
شفق پھوٹے گی اے آصف ترے خونِ گرمی و ستاں سے

ولہ

رعایا خوش ہے شہ کے بذل ظاہر فیض پنہاں سے
پہنچتی ہے طراوت خشک و تر کو فصلِ باراں سے
کئے ہیں انتظام ایسے ہوئے ہیں انتخاب ایسے
دکن کے پھر گئے دن عہدِ عثمان علیخاں سے
عجب کیا ہے زمینیں بے چراغ آباد ہو جائیں
یہ سنتے ہیں گزرنے کو ہے دجلہ اب بیاباں سے
عجب کیا ہے سنا کر رعبِ سلطانی کا افسانہ
رسن میں باندھ کر شیروں کو لے آئیں نیستاں سے

۲۵

۲۱۰

اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوئے سب پہلی منزل سے
خدا معلوم دو دو اشک بھی نکلے تھے کس دل سے

سنا جادو کو جل جاتے ہوئے کاجل کے بھی تل سے
نکل آیا ہے اک فتنہ سا فتنہ چاہِ بابل سے

اسیری میں بھی آزادی میں بھی رونا رہا ہم کو
قفس میں آئے بھی مشکل سے پھر نکلے بھی مشکل سے

رہا صفت کشت زار آرزو کی سعی بے جا سے
وہی اچھے رہے کچھ ہاتھ دھو بیٹھے جو حاصل سے

فلک کی گردشیں ہیں اور جائے امن ناپیدا
بھنور میں کشتی عمر رواں ہے دور ساحل سے

نہیں بحر فنا میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ
ملا پانی نہ چلو بھر کسی پیاسے کو ساحل سے

ہزار آنکھ اے فلک ہی تیرے کشتہ کی تماشائی
ستارے جھلملے میں آئینہ داری بسمل سے

تعلق سے جہاں کے اس طرح آزاد ہو جا تو
نکل جاتا ہے نالہ جس طرح طوق و سلاسل سے

میں اک افسردہ دل ہوں جاؤں کیونکر بزم عشرت میں
چمن میں بج رہا ہے ارغنوں صوت عنادل سے
میں اک شوریدہ سر ہوں مجھ کو لے جاؤ نہ دریا پر
نہ دیکھا جائے گا موجوں کا ٹکرانا بھی ساحل سے
شب غم میں ہوا ہے تجربہ یہ بارہا مجھ کو
اجل آتی ہے آسانی سے نیند آتی ہے مشکل سے
ذرا تو ہی بتا دے اب کدھر جاؤں کہاں بیٹھوں
جدا ہو کر ترے در سے نکل کر تیری محفل سے
حدی خواں دیکھنا ایسا نہ ہو پامال ہو جائے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی جاتی ہیں محمل سے
غبار اپنا فلک فرسا رہا شاہد ہے خود گردوں
کبھی دب کر نہیں رہتے کسی مدمقابل سے
کبھی چھوڑا نہ ہم نے شیوۂ اہل مروت کو
کبھی جھپکی نہ اپنی آنکھ دشمن سے نہ قاتل سے
جو ہیں بیدرد ان کا ذکر کیا جو چاہیں وہ سمجھیں
ترا وش وجد کی بھی ہے یہ افشانی بسمل سے
بڑے ہشیار ہیں اہل کرم بھی یہ میاں تو قائل ہوں

کہ جو دیتے ہیں اوس سے بڑھ کے لے مرتے ہیں سائل سے
بہانہ ہو گیا ہی اوس ستمگر پہ قتل خرمن کا
نجانے آہ نکلی تھی یہ کس کس دکھتے ہوے دل سے
ہمیں یہ بھی نہیں اب یاد حسرت کہتے ہیں کس کو
نہ آئی تھی کبھی دل میں نہ نکلی تھی کبھی دل سے
مرے غم سے کہیں احباب بھی غمگیں نہ ہو جائیں
یہی رہتا ہے اندیشہ کہ دل کو راہ ہے دل سے
رہی جب ناخن غم میں باقی نہ گیرائی
کھٹکتی ہے جگر میں یہ پھانس جو نکلی تھی جو دل سے
مگر نے میں ہے ظاہر ترے چہرے سے پشیمانی
زباں سے قتل کا انکار ہی اقرار ہے دل سے
مرے پہلو سے آخر اوٹھ گیا وہ بدگماں ہو کر
تڑپ جائیگا شکوہ دل کو بھی مجھ سے مجھے دل سے
نہو جو بات دل سے کچھ مزہ اوس میں نہیں آتا
محبت چاہیے دل سے عداوت چاہیے دل سے
خدا ہی نظم کا حافظ ہے اب کہدو یہ حافظ سے
شب تاریک بیم موج کشتی دور ساحل سے

نہ قصر دلکشا رکھے نہ باغ جانفزا رکھے
بڑی جاگیر تو یہ ہے کسی کے دل میں جا رکھے
غرض اس بد بیزار دہر سے کس کی بلا رکھے
نہیں ہیں نازکش اسکا یہ نازلینے اوٹھا رکھے
رگ گردن پہ جس کو ناز ہو تو جھک کے مل اوس سے
یہ دار ایسا ہے جو تسمہ نہ گردن میں لگا رکھے
غم و شادی کو میں ایسا ہی سمجھا جس طرح کوئی
لگائے خون دامن میں نہ ناخن پر حنا رکھے
وہ حاضر ہے جدھر چاہے اودھر سجدہ کرے انسان
وہ ناظر ہے۔ جدھر چاہے اودھر دست دعا رکھے
گواہی دے رہے ہیں روز محشر دست و پا سب کے
یہ حال اپنوں کا ہے غیروں سے پھر امید کیا رکھے
یہ کہہ کر ہاتھ دنیا سے اوٹھایا اہل ہمت نے
مناسب ہے وہاں کے واسطے بھی کچھ اوٹھا رکھے
تری سرکار سے میں ہوں قناعت فیض کو پہنچا
تجھے اللہ ساری خلق کا حاجت روا رکھے

فقط دو قرص ناں ہیں نعمت خوان پیر گردوں میں
اگر کھائے تو کیا کھائے اگر رکھے تو کیا رکھے

براق آیا زمیں پر عرش سے اور عرش پر پہنچا
فلک کو رہ گئی حسرت قدم یہ پا دیا رکھے

نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع گردوں لاکھ درپے ہو
اسیر قید غم رکھے گرفتار بلا رکھے

لحد میں مال و زر کچھ کام آئیگا نہ منعم کے
جسے خود کھود کر گاڑا ہو امید اوس سے کیا رکھے

کسی کے کوئی کام آتا نہیں وہ وقت آیا ہے
کہ انساں ہاتھ سے اپنے لحد اپنی بنا رکھے

جہاں میں آئے ہیں تنہا ہی اور تنہا ہی جانا ہے
بشر کاہیکو دو دن کے لئے جھگڑے لگا رکھے

کسی کو ملک و مال آساں نہیں دیتا کبھی گردوں
اگر یوسف بھی ہو پہلے کنوئیں اوس کو چھپا رکھے

۱۱ ولہ ۲۱۲

میں ہوں بندوں میں اوسکے جو محبت کی نظر رکھے
میرا احساں عمر بھر مانو تو احساں عمر بھر رکھے

ہمیشہ انتظارِ آمدِ بادِ سحر رکھے
بھروسہ زیست پر مثلِ چراغِ رہگذر رکھے

یہاں جو خار ہے دامن کشِ برقِ تجلی ہے
قدم راہِ سلوک و معرفت میں دیکھ کر رکھے

جو محرم ہو نہ راہِ شوق کا اوس کو یہ مشکل ہے
نظر بھی سوچ کر ڈالے قدم بھی دیکھ کر رکھے

نزاکت راہ چلنے کو ہے مانع بات کرنے کو
حسیں ہو کر بھلا کچھ تو دہن رکھے کمر رکھے

سکھاتا ہے غرورِ حسن یوں عاشق کشی اوس کو
زمیں پر پاؤں کیوں رکھو کہ وہ قدموں پہ سر رکھے

دبستانِ وفا سے پڑھ کے یہ دو حرف میں نکلا
کسی کا ہو رہے خود یا کسی کو اپنا کر رکھے

کبھی ششدر نہ ہو اس تختۂ نردِ دہر میں پھنس کر
نکل جانے کو اپنے راستہ چلنے کو گھر رکھے

صدا ہے طائرِ قبلہ نما کی پرفشانی میں
فلک دے لاکھ گردش منہ جدھر رکھے اودھر رکھے

بہت سے دل میں ہیں مضمون جو لب تک آتے جاتے ہیں

مناسب ہے، مجھے بھی ساتھ اپنے نامہ بر رکھے
قدح کش نظم ہے لیکن نہ ایسا بھی کہ اے واعظ
شراب کبر و نخوت شیشۂ توبہ میں بھر رکھے

۱۵ ۲۱۳

ملا تھا ایک ساغر زہر غم سے نیلگوں وہ بھی
ستم ہے اوس پہ تعزیر اے فلک حد سے فزوں وہ بھی
اثر ہوتا نہ ہرگز اہل دل پر صور محشر کا
صدائے چنگ ہوگی یا صدائے ارغنوں وہ بھی
بہار باغ اک ہنگامہ ہے چاک گریباں کا
جسے ہم جوش گل سمجھے ہیں جوش جنوں وہ بھی
نگیں کو ناز تھا جو سر پہ اپنے اور زیبا تھا
ہوا ہے نام کی خواہش میں لیکن سرنگوں وہ بھی
ہدف ہونے سے دل کو کس طرح کوئی بچا لیتا
نگاہ اس کج ادا کی اور نگاہ پر فسوں وہ بھی
تڑپ کر دل جو رہ جاتا تھا پہلے تو جاتا تھا
غنیمت تھی مجھے اک فرصت صبر و سکوں وہ بھی
فغاں کرنے پر اوس وادی میں تیر بھی ہے آمادہ

چھپے رہنے سے دل میں بن گئی سوزِ دروں وہ بھی
جہاں سے ہے وارستم شیوہ گردوں سے ظاہر ہے
کہ پہنا ایک ہی خرقہ ہمیشہ نیلگوں وہ بھی
ملے دنیا بھی اور عقبیٰ بھی یہ تو ہو نہیں سکتا
کیے جاتی ہے لیکن حرص میری یہ بھی لوں وہ بھی
تباہی میں کبوتر کی طرح تھا کوکب طالع
ہوا آخر سگار یچہ نحبت زبوں وہ بھی
کسی عیار نے باتیں سنا کر لے لیا دل کو
فسانہ میں تو سمجھا تھا مگر نکلا فسوں وہ بھی
نہیں اب داد خواہی کی ہوس اے داورِ محشر
کہ میں بھی ہوں پشیماں شرم سے ہے سرنگوں وہ بھی
مجھے سوزِ سیہ میں سایہ اپنا یاد آتا ہے
کہ میرے ساتھ تھا آوارۂ دشت جنوں وہ بھی
کہوں قصہ میں وا اغظا عنوانِ نوجوانی کا
حدیثِ عیش رفتہ سن کہ تھا خیر القروں وہ بھی
کوئی حرف تمنا ضبط کرتا ہوں جو اے حیدر
تو آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے بن کر اشک خوں وہ بھی

١٣ ٢١٤

ملی تھی راہ میں منزل سراب عمر فانی کی
یہاں نقش قدم سے اپنے تو نے کیا نشانی کی
صدا یہ آرہی ہے دور سے برگ خزانی کی
کبھی ہم نے بھی لوٹی تھیں بہاریں زندگانی کی
کسی پہ دل کا آنا موت تھی عہد جوانی کی
نہ بھولوں گا اسے یہ جان ہے ساری کہانی کی
کرامات صفا سی قلب کو پوچھو تو شبنم سے
فروغ شمع قتاں لے اوڑی اک بوند پانی کی
تجلی بھی ہوئی آخر تو موسیٰ نے نہ کچھ دیکھا
چکا چوندھ ایسی تھی آنکھوں میں برق لن ترانی کی
غبار اوٹھ کر مرا منزل کی جانب چند گام آیا
یہ ٹھوکر پڑ گئی کس رہ نورد کاروانی کی
کوئی حد بھی ہے ہستی کی ہزاروں سال جب گزرے
تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعریٰ یمانی کی
بگولوں میں نظر آتی ہے خاک و باد کی گشتی
عیاں ہے برق و باراں سے لڑائی آگ پانی کی

خیال آیا نہ مجھ کو حیف بعض الظن اثم کا
پشیماں ہوں کہ ناصح سو میں نے بدگمانی کی
حکومت کا مزہ ہم نے اوٹھایا پڑھ کے شاہو ں سے
کہ اپنے نفس سرکش پر ہمیشہ حکمرانی کی
خجالت سے خضر کا منہ چھپانا ہی مناسب ہے
کہ خواہش اور پھر وہ بھی حیات جاودانی کی
علم رکھتا نہیں گر تو قلم سے نام پیدا کر
مقام رشک ہے شہرت درفش کاویانی کی
یہ ہے نادر مرقع کارگاہ نظم کا حیدر
کہ ہیں لفظوں کے آئینہ میں تصویریں معانی کی

۳۱۵ — وله — ۱۱

بڑا غم ہو گا قتل عاشق ناشاد ومضطر سے
یقیں ہے تیغ قاتل خون روئے چشم جوہر سے
بھلایا حسن دنداں سے لب نازک کی خوبی کو
بجھادی آتش یاقوت تو نے آب گوہر سے
خرام ناز تیرا دیکھ کر ایسا عرق آیا
کہ آخر نقش ساری دھو گئے طاؤس کے پر سے

جو نازک طبع ہیں وہ سخت دل کے منہ نہیں لگتے
نہ باور ہو لڑا کر دیکھ لو شیشہ کو پتھر سے

حسینوں کی نزاکت دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا
کہ رخسارے تو ان کے پھول سے ہیں دل میں پتھر سے

خدا کے سامنے ہو گا خرامِ ناز کا شکوہ
گواہی دل کے پس جانے کی لینگے اہلِ محشر سے

اگر اونکی طرح میری پلک جھپکی ہو تو کہہ دیں
لڑائی آنکھ میں نے رات بھر ایک ایک اختر سے

کرامت تو نے رندوں کی نہیں دیکھی ہے ای زاہد
بڑھا کر ہاتھ بھر لیتے ہیں ساغر حوضِ کوثر سے

اثر دیکھے کوئی بیتابیِ دل کے مضمونوں میں
مرا مکتوب آگے جاتا ہے بالِ کبوتر سے

کسی کے شوقِ آرائش نے کی غارتگری کیسی
لیا اشتاق سے دل آئینہ چھینا سکندر سے

مروت نام کو تجھ میں نہیں ای برق کیا کہنا
لگا دی آشیاں میں آگ ورنہ تھی ہما دیر سے

۲۱۶ پری تھی آئینہ خانہ میں عکس حسن دلبر سے ۱۲
صدا پرواز کی آئی پرافشانی جوہر سے
سنو تم وصف میرے ہم سے سنا ہم نے پیمبر سے
پیمبر سن کے آئے ہیں زبان موج کوثر سے
جنوں میں سر کو ٹکرانا کبھی خالی نہ جائیگا
پری شیشہ سے اور شیشہ نکل آئیگا پتھر سے
سبک سر ہوکے جو خفت اوٹھائی ہے نہ کچھ پوچھو
گیا میں ڈوبنے پانی نہ اونچا ہو سکا سر سے
کھلا جب یہ کہ سب تیرے اشارے کے کرشمے ہیں
جگر کو تیر سے اک عشق ہے گردن کو خنجر سے
سنبھل کر ہر قدم راہ فنا میں چاہیئے رکھنا
کہیں دیوار بن جائے نہ اوٹھ کر گرد ٹھوکر سے
شب یلدا مری آبستن صبح قیامت ہے
مجھے محشر کے فتنے جھانکتے ہیں چشم اختر سے
صبا نے اے گل تر کو دئیے تیرے حواس آخر
کہا راز نہفتہ فاش اور ہنستا کھلا اوپر سے

سویدائے دل سوزاں سے کیا اسپند کو نسبت
کمالِ ضبط تو یہ ہے دھواں اٹھے نہ مجمر سے

نگیں میں سے ہی تنگِ تیزِ دندان جاتا ہوں میں
عبث ہی فکر آب پانی تو اونچا ہو چکا سر سے

جو ہو حاصل دلِ روشن نہ کر لافِ نسب ہرگز
صفا میں آئینہ کی فرق آجاتا ہے جوہر سے

غنیمت کیوں نہ میں سمجھوں دلِ پر درد کو حیدر
کہ یہ دولت جو ملتی ہے تو ملتی ہے مقدر سے

۲۹ ولہ ۲۱۷

شبِ ہجر میں اگر یاد آئے فلک و آفتاب آئے
یقیں ہے خرمنِ ہستک تو برقِ اضطراب آئے

شبِ غم میں کبھی ہنو نہیں ممکن کہ خواب آئے
تو کیوں کروٹ بدلوانے کو جوشِ اضطراب آئے

برنگِ مشک ترا بوں نہ گو رنگِ خضاب آئے
نہیں ممکن جوانی کی سی رخ پر آب و تاب آئے

مروت اسے ظالم کو نہ کچھ شرم و حجاب آئے
جو کچھ کہیے تو سیدھی بات کا اولٹا جواب آئے

روانی عمر کی ہے وادیٔ ہستی میں سیل آسا
حباب و موج کے مانند ہم پا در رکاب آئے
بڑھاتا ہے عبث تو ہاتھ دنیا کی طرف ناداں
خبر لے ہوش کی ہستی میں کیا موج سراب آئے
ترش روئی کی عادت تلخ کامی سے ہوئی پیدا
ہمارے سامنے ہو جائے سرکہ گر شراب آئے
نکلتا ہے اشارہ جھلملانے سے ستاروں کے
ازل کے روز سے لے کر دل پر اضطراب آئے
میں کیا جانوں گنہ اے کاتب اعمال کتنے ہیں
یہ جھگڑے اوس سے کر جس کو حساب آ گیا آئے
عناں گیر اوس کے توسن کا ہو جذب شوق تنہا ہو
غبار ناتواں تا حلقۂ چشم رکاب آئے
تلون کی بھی حد ہے اک نگاہ اتنے کرشمے ہوں
حیا آئے حجاب آئے غضب آئے عتاب آئے
ترے کہنے سے میں توبہ تو کر لیتا ہوں اے واعظ
رہا جاتا نہیں پھر جھوم کر جس دم سحاب آئے
ہوائے سرد مہری چل رہی ہے سارے عالم میں

نہ ٹھیرتا ہوا وقت سحر کیوں آفتاب آئے
فسانہ کی عوض اے داستاں گو پڑھ کوئی افسوں
اوتر آئے پری شیشہ میں گر آنکھوں میں خواب آئے
جہاں میں سرکشی کی ہم نے اس پر بھی شرار آسا
سراپا اضطرار آئے ہمہ تن اضطراب آئے
ملا نا آنکھ پھر منہ پھیر کر تیوری چڑھا لینا
یہ مطلب ہے چھری وہ مارئے جس کو نہ تاب آئے
ہوا ثابت یہ عیب دونوں کی ہستی اعتباری ہے
نہ کیوں گردوں سے پھر آنکھیں لڑانے کو حباب آئے
نہ آئے وہ ستمگر اور بہار اس طرح سے گذرے
تڑپ کر برق سہ رہ جائیں گھر گھر کر سحاب آئے
نگاہ شوق کے چلتے گیا صبر و قرار آخر
اسی رستہ سے شاید کاروانِ اضطراب آئے
نشاطِ عالم فانی ہے توام رنج و حرماں سے
سمجھئے چشم پر خوں اوس کو گر جامِ شراب آئے
گذرتا ہے کچھ اس انداز سے لشکر حوادث کا
کہ اوڑ کر سر پہ گردوں کے غبارِ انقلاب آئے

خدا نے کی ہے جنت واعظوں ہی کے لئے پیدا
اگر یہ میکدہ میں بھی گئے ہو کر شتاب آئے

بقدر یک نگہ مہلت نہ دی جب انتظار اوس کا
تو مشکل ہے بقدر یک مژہ آنکھوں میں خواب آئے

بہت اصرار کرنے سے اوٹھائی تو ہے آنکھ اوسنے
مگر چتون یہ کہتی ہے کہ آئے اور حجاب آئے

اگر سو مرتبہ آئے بہار اے آسماں تو کیا
کوئی گردش تو کر ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

یہ راتیں ہجر کی تارے ہی گنتے گنتے کٹ جائیں
فلک سمجھوں گا میں تجھ سے ذرا روز حساب آئے

سوا شام الم کے اور کیا دیکھیں گے دنیا میں
اوٹھیں اسوقت سو کر جب لب بام آفتاب آئے

حذر ہے زاہد سالوس سب کو تیرے سایہ سے
اگر آئے تو تھرا تا ہوا تیر شہاب آئے

رواں ہے توسن عمر اور پڑی تھم نہیں سکتی
تو پھر کس طرح قابو میں بیاض شباب آئے

۱۸ ولہ ۲۱۸

ادھر دل میں مری حسرت پہ حسرت بڑھتی جاتی ہے
ادھر شوخی پہ شوخی ہے شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمانہ میں نہ لیگا نام کوئی عشق بازی کا
ہمارا سانحہ سن سن کے عبرت بڑھتی جاتی ہے

الٰہی دل ہے یار کا یا آتش ہے پہلو میں
جو سوزش گھٹتی ہے گرد کدورت بڑھتی جاتی ہے

ادھر دیکھیں اللہ اکبر یہ خوشی گھر اپنے جانے کی
سحر کے ساتھ چہرے کی بشاشت بڑھتی جاتی ہے

جدائی میں مرا شاخ خزاں دیدہ کا عالم ہے
کہ رونق گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے

دبائے جاتے ہیں لالے کے تختے کوہ کا دامن
گھٹا کے ساتھ گلزاروں کی وسعت بڑھتی جاتی ہے

احبا گنتے ہیں گھڑیوں کے بدلے میرے نالوں کو
کہ جوں جوں رات جاتی ہے شکایت بڑھتی جاتی ہے

نہ پوچھو ہجر کی شب دم نکلنے میں ہے کیا لذت
چلی آتی ہے میٹھی نیند غفلت بڑھتی جاتی ہے

بہار گل میں ہے طاؤس آتش باز کا عالم

چمن میں پھول پھولوں میں شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمین شعر ہے کیونکر اوٹھاؤں میں قلم اپنا
کہ مثلِ نیشکر اس کی حلاوت بڑھتی جاتی ہے

نظر آتا ہے صحرا صاف بیٹھے بیٹھے زنداں میں
ہوائی موسم گل میں لطافت بڑھتی جاتی ہے

یہاں درگاہ میں ہر روز چلّے باندھی جاتے ہیں
وہاں نام خدا ہر ایک منت بڑھتی جاتی ہے

بناؤان کا پھیکا تھا بہار آئی نہ تھی جب تک
مبارک ہو انہیں مہندی کی رنگت بڑھتی جاتی ہے

بہار آئی ہے کاٹے کھاتی ہے زنجیر زنداں میں
گریباں نے گلا گھونٹا ہے وحشت بڑھتی جاتی ہے

گلے سے میرے وہ خود آبدیدہ ہو کے لپٹے ہیں
خجل میں اگلی باتوں پر ندامت بڑھتی جاتی ہے

مسلمانوں کے اوس کافر ادا سے خون ہوتے ہیں
زمین کربلا کی روز قیمت بڑھتی جاتی ہے

سمجھ کر ہم کو اپنا شیفتہ اللہ رے ناز اون کے
جہاں تک منتیں ہوتی ہیں نخوت بڑھتی جاتی ہے

پتا حیدر کا دو دو دن نہیں ملتا احبا کو
نجانے کس پری رو سے محبت بڑھتی جاتی ہے

۲۰ ولہ ۲۱۹

بیانِ سوزِ غم کا ہر کہیں اک طومار ہوتا ہے
کلیجہ اوس کا پھٹ جاتا ہی جو غمخوار ہوتا ہے
اوسی پر حضرتِ واعظ کو کچھ اصرار ہوتا ہے
جو افسانہ بعید از عقل و دور از کار ہوتا ہے
دیے جاتے ہو غیروں کو تم ساغر پئے جاؤ
عنایت مجھ پہ کیوں ہے مجھ سے کیوں اصرار ہوتا ہے
گواہی دیتی ہی چہرہ کی سرخی دیکھ لے ساقی
کہ شرمندہ ترے احسان سے میخوار ہوتا ہے
خطا کرتا نہیں گردوں سے جو تیر قضا آیا
نجانے کسکی چٹکی میں لبِ سوفار ہوتا ہے
ستم کا تیرے میں اے آسماں شکوہ نہیں کرتا
ترے ناوک میں اندازِ نگاہِ یار ہوتا ہے
اوسی دن سے ہوں اے برقِ تجلی منتظر تیرا
کہ دیکھا میں نے گلشن میں فروزاں خار ہوتا ہے

تڑپنے لوٹنے کا تما فرد عہد جوانی تک
گئی فصل جنوں اب درد دل بیکار ہوتا ہے
مجھے ظل ہما کی آرزو ہرگز نہیں ہوتی
میرے سر پر جب اوس کا سایۂ دیوار ہوتا ہے
مژہ اس راستی پر بھی رہا کرتی ہے کج مجھ سے
شکایت اوس کی کیا ابرو تو پھر خمدار ہوتا ہے
جہاں میں کامیابی ہے کرشمہ جوش ہمت کا
اگر یہ لہر آ جاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے
ہوا اور پھر وہ یہ سب تیرے خزانے میں
وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے
تجھے دشوار سا دشوار بھی آساں سے آساں ہے
مجھے آسان سے آسان بھی دشوار ہوتا ہے
اگر دنیا سے استغنا ہو مر رہنا بھی ہے آساں
ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے
کھلا یہ رمز تاب آفتاب و شبنمستاں سے
ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب بیدار ہوتا ہے
گذرگاہ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں

کہ تھم جاتا ہے گرد دیار رواں کہسار ہوتا ہے
قضا کس آئینہ خانہ میں دوڑاتی ہوئی لائی
بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے
حذر اے آسماں کنا مرادوں کے ستانے سے
الجھ پڑتا ہے وہ جو زیست سے بیزار ہوتا ہے
صفائے دل کو ساتھ اپنے لئے جاتا ہوں مرقد میں
کہیں اب حشر تک میلا کفن کا تار ہوتا ہے
رسائی چاہتا ہوں نظم اپنی کعبۂ دل تک
تو پہلے سنگ رہ بت خانۂ پندار ہوتا ہے

۲۱ ۲۲۰

پھنسا دینگے غزالان حرم اپنا حرم پہلے
وہ پھینکیں تو کمند طرۂ زلف رسا پہلے
طبیعت میں کہاں تھا خود پرستی کا مزہ پہلے
بھلا آئینہ کب تھا قبلۂ ناز و ادا پہلے
نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حال عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے
ہوئی ہر صبح کیا جلد آج کی شب وہ جو مہماں ہیں

وہی یہ رات ہے جسکی نہ تھی کچھ انتہا پہلے
بہار آئی ابھی میں نغمۂ بلبل نہیں سنتا
مبارکباد کی دے شیشۂ توبہ صدا پہلے
سجانے کوئی حیلہ نکلے یا ہو عیش کا ساماں
گلے کا ہار ٹوٹے پہلے یا بندِ قبا پہلے
خدا نے خیر کی منہ کیا دکھاتا تیرہ بختی کو
سر بالین تربت شمع سے آئی ہوا پہلے
شبِ فرقت میں کی اس شک عیسیٰ نے مسیحائی
سحر کی دے گئی مجھ کو خبر بادِ صبا پہلے
مجھے اب کب نہیں بھولا تصور دستِ رنگیں کا
تمھارے ہاتھ سے جاتا رہا رنگِ حنا پہلے
تہیا اے جنوں اپنا بھی ہے کوہ و بیاباں کا
چلے ہم بھی نکل جانے وہی یہ کالی گھٹا پہلے
جواب افسوں طرازی گر نہ اس کا ہے نہ اُس کا ہے
قلم ٹوٹے مرا پہلے کہ موسیٰ کا عصا پہلے
زمیں سے کس طرح احباب کے کہنے سے میں اٹھوں
اوٹھانا چاہیے اوس بے وفا کا نقشِ پا پہلے

اوٹھتی ہے نسیم صبح آنچل روئے روشن سے
چھپا لے مطلع خورشید تاباں کو گھٹا پہلے

انھیں بیتابیوں نے اس کے کوچہ سے نکلوایا
کہ جاتے ہی اوٹھایا پردۂ دولت سرا پہلے

زباں تک بھی پہنچنا ضعف سے دشوار ہے اب تو
نکل جاتی تھی دو دو تیر تک آہ رسا پہلے

وہ کوٹھے پر چڑھینگے برق و باراں کے تماشے کو
الٰہی غیر کی آنکھوں میں چھا جائے گھٹا پہلے

خضر کیا جانیں کیا لذت ہے مرنے میں حسینوں پر
پشیمانی اوٹھائی پی لیا آب بقا پہلے

برا ہوتا ہے دھڑکا ساتھ والوں کے بچھڑنے کا
کبھی سننے میں آتی تھی نہ فریاد درا پہلے

سما سکتا نہیں اب پیرہن میں حسن روز افزوں
نہ یوں ہر روز ٹوٹا کرتے تھے بند قبا پہلے

شکایت کیسی اولٹی منتیں کرنا پڑیں آخر
یہ شوخی دیکھئے خود ہوگئے ہم سے خفا پہلے

حجاب آئے اسے کیونکر نہ شبنم کے دوپٹہ میں

کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ عید رجا بجا سے پہلے

٢٢١ وله ١٢

اوڑا کر کاگ شیشہ سے گلگوں نکلتی ہے
شرابی جمع ہیں میخانہ میں ٹوپی اوچھلتی ہے
بہار بیکسی آئی چمن کی رت بدلتی ہے
گھٹا مستانہ اوٹھتی ہی ہوا مستانہ چلتی ہے
زِ خود رفتہ طبیعت کب سنبھالے سے سنبھلتی ہے
نہ بن آتی ہے ناصح سے نہ کچھ واعظ کی چلتی ہے
یہ کس کی ہے تمنا چٹکیاں لیتی ہے جو دل میں
یہ کس کی آرزو ہے جو کلیجہ کو مسلتی ہے
وہ دیوانہ ہی جو اس فصل میں فصدیں نہ کھلوائے
رگِ ہر شاخ گل سے خون کی ندی اوبلتی ہے
سحر ہوتے ہی دم نکلا غش آتے ہی اجل آئی
کہاں ہوں میں نسیم صبح پنکھا کس کو جھلتی ہے
تمتع ایک کا ہی ایک کے نقصان سے عالم میں
کہ سایہ پھیلتا جاتا ہی جوں جوں دھوپ ڈھلتی ہے
بنا رکھی ہی غم پر زیست کی یہ ہو گیا ثابت

نہ لیکا آہ کا چھوٹے گا جب تک سانس چلتی ہے
قرار اک دم نہیں آتا ہے خون بے گنہ پی کر
کہ اب تو خود بخود تلوار رہ رہ کر اوگلتی ہے
جہنم کی نہ آنچ آئے گی میخواروں پہ او واعظ
شراب آلودہ ہو جو شئے وہ کب آتش میں جلتی ہے
نہ دکھلانا الٰہی ایک آفت ہے شبِ فرقت
نہ جو کاٹے سے کٹتی ہے نہ جو ٹالے سے ٹلتی ہے
یہ اچھا شغلِ وحشت میں نکالا تو نے اے حیدر
گریباں سلے میں الجھنے سے طبیعت تو بہلتی ہے

21 فاعیل مفاعیل مفاعیل فعولن 222

ہے تل کو یہ منظور کہ چھپ جائے نظر سے
گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے
آنکھوں میں جو رہتے تھے وہ او جھل ہوئے نظر سے
پوچھے یہ کوئی چاہنے والے کے جگر سے
آتے ہیں مگر برہمی طبع ہے ظاہر
اغماض ہے انداز سے تیور سے نظر سے
کٹ جاتی ہے آخر شبِ غم ہو کہ شبِ عیش

ہوتی نہیں کچھ رات سوا چار پہر سے
ہر اک حرکت کے لئے اک روز سکوں ہے
رفتارِ فلک کم نہیں پروازِ شرر سے
ہم بھی ہیں کھنچے سر دجو رہتا ہے کشیدہ
سایہ کے بھی طالب نہ ہوئے ایسے شجر سے
میں عکس ہوں اور آئنہ ہے گوشۂ عزلت
صورت نہ دکھاؤں گا جو نکلا کہیں گھر سے
ہو جاتا ہے رخسار کدیور کا وہ غمازہ
گلزار میں جو رنگ ٹپکتا ہے ثمر سے
پائی نہ خبر قافلۂ عمر رواں کی
پھر آئے پلٹ کر یہ مسافر نہ سفر سے
سو عیب تھے مجھ میں نہ رکھا ایک بھی منہ پر
شکوہ مجھے رہ جائیگا یہ اہلِ ہنر سے
انساں وہی انسان ہے جو مشتاق ہوا اس کا
کانوں سے سنا جس کو نہ دیکھا ہو نظر سے
اک دم میں بہارِ شبِ عشرت ہوئی آخر
گل ہوگئیں شمعیں نفسِ بادِ سحر سے

ہے دور میں ساغر کے یہاں جلوۂ خورشید
رندوں کا الگ دائرہ ہے دورِ قمر سے

جانے کا تری بزم سے رستہ نہیں ملتا
یہ بھی نہ رہا یاد کہ آئے تھے کدھر سے

عالم میں سخن فہم کسی کو نہیں پاتا
باتیں میں کیا کرتا ہوں دیوار و در سے

انداز نہ اپنا نگہ مست نے چھوڑا
سو شیشۂ دل چور ہوئے گر کے نظر سے

کچھ وعظ میں شوخی ہے نہ انداز میں گرمی
محروم جو ہے زاہدِ خشک آتشِ تر سے

نکلا ہوں نہ نکلوں گا کبھی کوچہ سے تیرے
اوٹھا ہوں نہ اوٹھونگا کبھی میں ترے در سے

عزلت تری ہم کو بھی پسند آگئی اے سرو
اب ہم نے بھی دامن کو لپیٹا ہے کمر سے

پھر ساغرِ جم ہو تو نظر بھر کے نہ دیکھیں
لبریز کیا جام کو جب خونِ جگر سے

اے نظم اوٹھا زانوئے غم سے نہ ترا سر

نکلا سرِ خورشید گریبانِ سحر سے

۲۲۳ —— ۲۶

چھائی ہے محبت جو دھواں دھار کسی کی
صورت نظر آتی نہیں جز یار کسی کی

عبرت مجھے ہوتی ہے پلٹنے پہ صدا کے
اک بات اٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

یوں مر کہ نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مردہ
یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

اچھی بھی گذر جاتی ہے انسان کی بری بھی
رہ جائیگی آسان نہ دشوار کسی کی

پانسے کی طرح کروٹیں لیتا ہے ستارہ
ہے جیت کسی کی نہ سدا ہار کسی کی

کہتا ہے قلم سجدوں میں جبتک نہ کٹے عمر
کیونکر ہو زباں واقفِ اسرار کسی کی

مارے ہوئے ہیں عشق کے نرگس ہو کہ گل ہو
زخمی یہ کسی کا ہے وہ بیمار کسی کی

اوس ترک کا کھینچیں گے گریباں تہِ محمل
ہاتھ آج کسی کا چلے تلوار کسی کی

سبزہ پہ بکھر جاتا ہے جب سبحہ شبنم
پڑھتا ہے وہ تسبیح لگاتار کسی کی

مرقد ہی پہ بس جا کے تھمے گا فرسِ عمر
کب ان کو مانے گا یہ رہوار کسی کی

بوسے ترے پیکان کے لیتا ہے کوئی زخم
پہنچی ہے ہنسی تا لبِ سوفار کسی کی

تڑپا گیا دل کو مرے بجلی کا تڑپنا
دکھلا گئی جھلکی مجھے ہر بار کسی کی

گرجی ہوئی دیوار ہے زنداں کی ہماری
زنجیر میں دیکھی ہے یہ جھنکار کسی کی

مرقد وہ جگہ ہے کہ اوتر جاتا ہے سر سے
تاج اس میں کسی کا ہو کہ دستار کسی کی

بسمل ہوا جاتا ہوں تڑپتا نہیں لیکن
تڑپوں گا جو خالی گئی تلوار کسی کی

واعظ ہو کہ ناصح ہو یہ ہے فصلِ بہاری
ہم رند اوٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

کچھ پاس ہے تم کو نہ فلک کو نہ اجل کو
دل سے وہی باتیں میں کیا کرتا ہوں پہروں
کانٹوں میں گلا ہو نہ گردن پہ چلے تیغ
پامال کرے شوق سے مجھ کو سرِ محشر
وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا تو چلے ہم
چھپ چھپ کے بھی دیکھوں تو چھپ جاتی ہیں نظریں
تم غیر سے ملنے لگی تو ہو لیکن
کیا ضبط محبت نے گلا گھونٹ کے مارا
ہیں پاؤں پہ گرتا ہوں اٹھا دے فتنہ محشر
رعشہ سا نظر آتا ہے شاخ گل تر میں

۲۲۴

آنکھوں میں مروت نہیں ہے یار کسی کی
کیا دل میں اتر جاتی ہے گفتار کسی کی
تقدیر سے چلتی نہیں زنہار کسی کی
سیکھی ہے قیامت نے جو رفتار کسی کی
دیکھے گا نہ اب راہ یہ بیمار کسی کی
اتنی بھی نہ ہو طاقتِ دیدار کسی کی
بھولے سے قسم کھائی ہے سو بار کسی کی
فریاد تھی جیسے کہ گنہگار کسی کی
ملتی ہے تری چال سے رفتار کسی کی
لڑنے پہ کلائی جو ہے تیار کسی کی

۴

ولہ

کیا عاشق ناشاد کو وہ شاد کریں گے
یہ تیرا آستانا بھی بہت یاد کریں گے
جب وہ کوئی طرز ستم ایجاد کریں گے
رہ جائیگی بات اور نکل جائیگا پہلو

آئیگا اگر رحم تو بیداد کریں گے
ماتم ترا برسوں دلِ ناشاد کریں گے
یاد آؤنگا میں مجھکو بہت یاد کریں گے
اے پیر مغاں ہم تجھے کیا یاد کریں گے

۲۲۵ — مفعول مفاعیلن دو بار — ۱۸

یہ ذوقِ تماشا کا حاصل نظر آتا ہے ❊ اندھیر اب آنکھوں سے تا دل نظر آتا ہے

تو آپ ہی اپنے میں حائل نظر آتا ہے ❊ اور آپ کو پا جانا مشکل نظر آتا ہے

عالم میں گراں ہا یہ بس دل نظر آتا ہے ❊ پلہ یہ ترازو کا مائل نظر آتا ہے

جلدی سے ہے پہونچنی کی مجھکو درِ جاناں تک ❊ اک ایک قدم اب تو منزل نظر آتا ہے

گرداب سرِ رہ ہے کشتی کو بچا کر چل ❊ کترا کے نکلنے میں ساحل نظر آتا ہے

اے ذوق نوا سنجی پھیری ہے چھیری تو نے ❊ طوطی پس آئینہ بسمل نظر آتا ہے

بس ایک ہی پرتو کا سارا یہ کرشمہ ہے ❊ اب آئینہ خانہ بھی محفل نظر آتا ہے

دے آئینہ دل کو پرواز کدورت سے ❊ اندیشہ خود بینی باطل نظر آتا ہے

کشتی ہو جو طوفانی اوس وقت خدا کو ❊ منجدھار سے تے کرتا ساحل نظر آتا ہے

بیدرد خدا سے ڈر توڑ اسکو نہ اے گلچیں ❊ مجھکو تو سر اک غنچہ اک دل نظر آتا ہے

بس نام ہی نام اب تو سنتے ہیں محبت کا ❊ اس لفظ کا بھی کوئی محمل نظر آتا ہے

گنجینۂ معنی ہے ضائع نہ کر اس دل کو ❊ اب اس میں وہ عالم کا حاصل نظر آتا ہے

حسن اور محبت کا لازم ہے نہاں رہنا ❊ کب جان نمایاں ہے کب دل نظر آتا ہے

گر در پہ رم آہو ہے یا رنگ پریدہ ہے ❊ جو نجد سے لے کر تا محمل نظر آتا ہے

یا رب یہ سویدا ہے کس کے دلِ پر خوں کا ❊ برگ گل لالہ میں جو تل نظر آتا ہے

کشتی کو لگا دے پر اے باد مراد آ کر ❊ آغوش کو پھیلائے ساحل نظر آتا ہے

تھامے ہے وہی انساں جو ظالم و جاہل بھی ❊ جو بار امانت کا حامل نظر آتا ہے

یا الٰہی سخن گو سبھی نظم میں ہیں دل
اس بزم میں تو لیکن بیدل نظر آتا ہے

۲۲۶ —— فعلاتن مفاعلن فعلات —— ۱۹

ہوں جو مہمان رات بھر کے لئے
حشر برپا کریں سحر کے لئے

سوز دل کیا بجھے کہ آپ آئے
آگ لینے کو لمحہ بھر کے لئے

جتنے عشوے تھے چشم ساقی میں
اوتنے ساغر حباب کر کے لئے

تیری زینت گہر سے کیا ہو گی
آبرو ہو گئی گہر کے لئے

پہلے جو دامن و گریباں تھا
اب ہے رومال چشم تر کے لئے

پہلے ہاتھوں سے تھامتا تھا جگر
ہاتھ ملتا ہوں اب جگر کے لئے

دم رفتار حشر نے اوبھر کر
قدم اوس شوخ فتنہ گر کے لئے

کیوں لگائی ہے ڈاب کافی تھا
ایک چھلا تری کمر کے لئے

نزع میں میں نے ہر طرف دیکھا
آپ آئے نہ لمحہ بھر کے لئے

ہم تو سمجھے تھے زیست ہی کو عذاب
لاکھ ہیں آفتیں بشر کے لئے

عرش کے کنگروں پہ نالوں نے
ٹھوکریں کھائی ہیں اثر کے لئے

زاہد آئے جو بزم میں ساقی
رہنے دینا نظر گذر کے لئے

سر کو رکھے ہوں خاک در پہ ترے
کیا یہ صندل ہے درد سر کے لئے

کیا غضب ہو گیا اگر دیکھا
دل تڑپتا تھا اک نظر کے لئے

نگہ التفات جس کی ہو
اوس کا بندہ ہوں عمر بھر کے لئے
موت کا ڈر تو کچھ نہیں لیکن
زادرہ چاہیئے سفر کے لئے
بے سر و پا جو ہو کرے کیا فکر
پاؤں کے واسطے کہ سر کے لئے
کبھی کھلنا کلی کو ہو نہ نصیب
بند مٹھی رہے جو زر کے لئے

ہجر کی رات ہے یہ رات اے نظم
منتیں مانئے سحر کے لئے

۲۲۷ ـــــــ ونہ ـــــــ ۱۵

راز افشا کہیں نہ ہو جائے
فتنہ برپا کہیں نہ ہو جائے
حب دنیا کہیں نہ ہو جائے
دیکھ سودا کہیں نہ ہو جائے
کون واعظ کے منہ لگے جاکر
مفت جھگڑا کہیں نہ ہو جائے
خون دل آتے آتے آنسو بنیں
تتوڑا تتوڑا کہیں نہ ہو جائے
دیکھ لے آنکھ بھر کے دنیا کو
یہ تماشا کہیں نہ ہو جائے
خواب مرقد میں بھی یہ دھڑکا ہے
حشر برپا کہیں نہ ہو جائے
ضبط نالے نہ کر دل بیمار
درد پیدا کہیں نہ ہو جائے
بڑھتے بڑھتے یہ کاکل شب رنگ
شب یلدا کہیں نہ ہو جائے
ناز کو ہے خیال پردہ دری
کوئی رسوا کہیں نہ ہو جائے
نہ لب بام مجھ کو ترلو او
لب دریا کہیں نہ ہو جائے

پھر نہ چہرے پہ چھوڑئیے زلفیں — پھر اندھیرا کہیں نہ ہو جائے
شام ہی سے سحر کا ذکر نہ کر — دل کو دھڑکا کہیں نہ ہو جائے
دل پر سوز پر نہ رکھو ہاتھ — ید بیضا کہیں نہ ہو جائے
صاف ہے چاندنی نہ الٹو نقاب — چاند دھبا کہیں نہ ہو جائے

استاد عوی نیاز کا اے نظم
ناز بیجا کہیں نہ ہو جائے

۲۲۸ — ولہ — ۱۳

طرز دکھلا دے اوس کی قامت کے — پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے
دن نہ گئے اگر مصیبت کے — ہم تھے مہمان چند ساعت کے
میرا ساغر رہا نہیں خالی — صدقہ ہو جاؤں اس کی رحمت کے
دل لگا کر کوئی سنے تو کہوں — جو فسانے ہیں دل کی حسرت کے
وقت پر تم نے لی خبر ورنہ — مر گئے ہوتے ہم تو مدت کے
گر نہیں ہے ریا تو رندوں میں — ہیں یہ آثار اہل جنت کے
مشت خاک اور یہ ماہی ابھی — کارخانے ہیں تیری قدرت کے
اے صبا تذکرہ وطن کا نہ کر — رہنے والوں سے دشت غربت کے
فاتحہ پڑھ کے لی جو ٹھنڈی سانس — جھلملائے چراغ تربت کے
کھل گیا راز دل نہ مدفن پر — پھول نکلے جگر کی رنگت کے

آدمی آدمی کے کام آئے
یہی معنی ہیں آدمیت کے

حشر پر رکھا وعدۂ دیدار
یہ کنائے ہیں کس قیامت کے

اپنے مذہب میں ہے یہی توحید
نظم بندہ ہیں ہم محبت کے

۲۲۹ —— فعولن چار بار —— ۱۲

جو نالے لب پیر کنعاں سے نکلے
لئے ساتھ یوسف کو زنداں سے نکلے

اجل پر ہی تہمت قضا پر ہے بہتاں
یہ سب شعبدے چشم فتاں سے نکلے

وہ نازک طبیعت ہے نامہ ہوا ایسا
کہ طومار مضمون عنواں سے نکلے

اُتر آئے وہ پیچ سب میرے دل میں
جو کافر کی زلف پریشاں سے نکلے

کسی کو غش آجائے وقت نظارہ
ہوا بھی نہ ظالم کے داماں سے نکلے

عنادل کریں جب ہزاروں ہی نالے
تو اک آہ لبہائے خنداں سے نکلے

کھلا مجھ پہ واعظ کا زہد ریائی
یہ حضرت بھی کچھ نا مسلماں سے نکلے

جسے رند بے باک سمجھا تھا زاہد
وہی لوگ کچھ اہل عرفاں سے نکلے

ق

کبھی ابر کے ساتھ پھرتے تھے ہم بھی
خیاباں میں پہونچے بیاباں سے نکلے

چھڑاتے ہوئے شاخ گلبن سے دامن
اُلجھتی ہوئی سنبلستاں سے نکلے

کبھی گل کے رخسار پر منہ کو رکھا
کبھی جھٹکے سرو گلستاں سے نکلے

غرض یہ کہ بزم خرابات میں بھی
گئے اور ہو کر پشیماں سے نکلے

۲۰

اثر گوش گل تک رسا ہو گئی
مری نامہ باب صبا ہو گئی
یہ تھی فرصت عمر یا شمع تھی
نہ ہو حکم برہم کہا اس نے کُن
سیاہوں سے رندوں کے ظلمت جو تھی
رو قافلہ تک پہونچنے میں گرد
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
ہے آپس میں اب تو عناد و نفاق
گری تھی ابھی برق مسکر نگاہ
نظر کا نظر سے ملانا تھا
زیادہ تمنا بھی اچھی نہیں
ہوئی ہاتھ ملتے ہی ملتے ملف

۱۲

تو شبنم در بے بہا ہو گئی
ابھی آئی تھی پھر ہوا ہو گئی
ذرا جھلملائی فنا ہو گئی
عیاں خفض سلسلہ ماسوا ہو گئی
سمٹ کر وہ کالی گھٹا ہو گئی
بہت دور بانگ درا ہو گئی
غضب ہے جو غفلت ذرا ہو گئی
محبت وہ اگلی ہی کیا ہو گئی
اوٹھی گر کے تیغ قضا ہو گئی
لڑائی کی اس پر بنا ہو گئی
اجل آتے آتے خفا ہو گئی
جوانی تو رنگ حنا ہو گئی

۲۳۱ — فاعیل مفاعلن مفاعیل — ۱۰

بدعت مسنون ہو گئی ہے
کیا کہنا تری دعا کا زاہد
رہنے دو اجل جو گھات میں ہے

امت مطعون ہو گئی ہے
گردوں کا ستون ہو گئی ہے
مجھ پر مفتون ہو گئی ہے

حسرت کو غبار دل میں ڈھونڈو | زندہ بہ درون ہو گئی ہے
وحشت کا تھا نام اول اول | اب تو وہ جنون ہو گئی ہے
واعظ نے بری نظر سے دیکھا | مے شیشہ میں خون ہو گئی ہے
عارض کے قرین گلاب کا پھول | ہر رنگ کی دون ہو گئی ہے
حل کر دیو و ملک کی سیرت | طرفہ معجون ہو گئی ہے
بندہ ہوں ترا زبان شیریں | دنیا ممنون ہو گئی ہے

حیدر شب غم میں مرگ ناگاہ
شادی کا شگون ہو گئی ہے

۲۲ —— تضمین دعائیہ —— ۱۴

فلک مطیع رہے بخت سازوار رہے | اساس دولت و اقبال پائدار رہے
یہ اوج منزلت و جاہ برقرار رہے | ہمیشہ خلق میں عنواں ترا وقار رہے

نبی کا لطف رہے فضل کردگار رہے

فروغ مہر پہ چمک کر نگین دکن | چمک سے جس کی فروزندہ ہو جبین دکن
فلک پہ سنبلہ ہو جائے خوشہ چین دکن | عروج پائے تری دم سے سرزمین دکن

ترے قدم کا سر آسمان غبار رہے

اسی طرح سے رہے اوج موج شوکت میں | اسی طرح سے رہے لہر بہر دولت میں
یونہی نسیم طرب گل فشاں ہو صحبت میں | خزاں نہ آئے کبھی تیرے باغ عشرت میں

خدا کرے کہ ہمیشہ یہی بہار رہے

ہمیشہ سایہ رہے تیرا ملک و ملت پر | ہمیشہ دست عطا زر فشاں رعیت پر
کرم کی شان رہے اس عروج و رفعت پر | نگاہ لطف ہو وابستگان دولت پر

یہ باہمی جو تعلق ہے خوشگوار رہے

رہے جہاں میں تو حامی دین و دولت و داد | رہے خزانہ زر افشاں ہمیشہ ملک آباد
رہے زمانہ میں سرسبز تیرا باغ مراد | رہے نہال ترے سایہ میں تری اولاد

تری امید کا ہر نخل بر قرار رہے

جو خیر خواہ کے حق میں کرم ہے رشک سحاب | نگاہ قہر بد اندیش کو ہے برق عتاب
نہ مثل تیری کرم کا نہ ہے ستم کا جواب | بہ رنگ گل تر و تازہ رہیں ترے احباب

مثال زخم عدو تیرا دل فگار رہے

رہے مدام درخشندہ اختر طالع | کہ خیر خواہ کریں شکر نعمت صانع
یہ عرض نظم کی ہے جو ہے بندۂ تابع | دعا ہماری یہ دل سے ہے آصف سابع

مدام ملک دکن کا تو تاجدار رہے

۲۳۲ غزل و قصیدہ بمدح خسروی ۱۳ شت

دزدیدہ نگاہیکہ بہ تیر قضا داشت | دل از کف من برد و جفا کرد و روا داشت
دردیدہ و دل شوق فراوان تو جا داشت | ایں ذوق جفا داشت و آں چشم وفا داشت
دل تنہا نہ غم و آں طرف ارض و سما داشت | وہم است ترا ایں کہ بہ پہلوئے تو جا داشت

هر چند که گردون هوس جور و جفا داشت
از فکر بیا سود دل من که خدا داشت

تا عکس خود افگند بشوخی و روان شد
آئینهٔ او حیرت نقش کف پا داشت

در دست حنا بستهٔ او دزد حنا بود
این وز ندانم ید بیضا ز کجا داشت

خون ریختی و عربدها کردی و شادم
دانم که بر این کار ترا ناز و ادا داشت

چون قافلهٔ بیم خرد و هوش روان شد
رنگیکه پرید از رخ من بانگ درا داشت

فریاد ازین عاقبت طالب دنیا
میرفت بسوی عدم و رو بقفا داشت

آن طائر نادان که بقید قفس آمد
بیچاره ندانست که در پیش چها داشت

دل دوخته ناوک کشش سرمهٔ جادو
دنبالهٔ او وره زکجا تا بکجا داشت

در دولت این خسرو عادل عجب اینست
دیدم صف مژگان که دو صد فتنه بپا داشت

برجستم و این مطلع برجسته بخواندم
پیش شه ذیشان که لقب ظل خدا داشت

۲۳۴ ——— (مطلع) ——— ۱۱

صد لطف بهر عاجز و مسکین شه ما داشت
شه دست کرم داشت و او دست دعا داشت

هنگام تکلم لب لعلش گهر افشاند
هر گوهر غلطان بگره آب بقا داشت

صد نکته فزود است بدیوان سیاست
صد عقده کشود است بفکریکه رسا داشت

آوازه شنیدیم و دویدیم بسویش
سنگ در او منزلت کوه صفا داشت

تا رایت اقبال تو بر اوج ظفر تافت
افشاند براهش پر و بالی که هما داشت

تا عدل شهی مژده امنی بجهان داد
تا نیست شده گردون که سر جور و جفا داشت

ازنکہتش ملک دکن تازہ جواں شد — شمشیر و کمر داد بہ پیرے کہ عصا داشت
یا معدلتش دست ضیعفاں بہ گرفتت — ویدم پر کاہے کشش کاہربا داشت
تا از نفحت باد بہاری بوزیدست — گلزار دکن از سر نو نشو و نما داشت
بدخواہ تو گشت است چناں عاجز و رسوا — دیدند کہ او پایۂ گل بر سر بے ہوا داشت

صد بار دم از ناز و تفاخر بزند نظم
بارے بہ صفِ حاشیہ بوسانِ تو جا داشت

۷ (نظام گزٹ سے منقول ہے) ۲۴۵

اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کر۔
اعلیٰ حضرت ظل اللہ کا وجود ذی جود ایسی نعمت ہے جس کی
تاریخ اوراق روزگار و صفحات قلوب پر ابد آلا باد تک نقش رہیگی
جکی نعمتوں کی برکتوں کا شمار و احصاء زبان و قلم کے حیطۂ امکان
سے باہر ہے یہ ترانہ سالگرہ با تمثال امر باری زبان قلم پر جاری
ہوا۔

اٹھائیس قافیوں میں سات شعر کی قید تھی

(حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

جوشِ گل جوشِ طرب جوشِ بہار است اینجا
گل فشاں نغمہ ز منقارِ ہزار است اینجا

از چراغاں شدہ ہر کوچہ و برزن پر نور
کہکشاں جادہ بہ [illegible] است اینجا
شعلۂ ور رخنۂ شمع ست بہم پیوستہ
تاج زریں ز طرب بر سر خارست اینجا
من کہ در ظل خدا نور خدا می بینم
چشم بر ہم زنم جلوۂ یار است اینجا
شام یک مژدۂ امن ست و سحر مژدۂ عیش
ہر دو یک اند مگو لیل و نہارست اینجا
شب این جشن و فلک عقد ثریا در دست
یعنی این سلک گہر بہر نثارست اینجا
نغمۂ نظم کجا بار دریں بزم سحؔا
مجمعے خوش ز امیران کبارست اینجا

ملمع

۲۳۶ | ۴۲

وارفتۂ حرف حق ہیں اہل توفیق
یہ موعظۂ پیر طریقت سمجھو

خنظل بھی جو ہو تو جانتے ہیں مصری
طبتم اخذتم علیہا اصری

رباعی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے
سالک وہ نہیں جو محو نظارہ ہے

دیکھو آنکھیں جو دو نوں تیجی کر لیں	پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

رباعی

آئینہ سے نیک نام اسکندر ہے	آئینہ جڑا ہوا انگوٹھی پر ہے
نام اس کا اسی نگینہ پر ہے کندہ	شاہی کا نگیں ہے نہ اب انگشتر ہے

رباعی

جو ظلم کئے تھے وہ ذرا سہہ تو سہی	انصاف خدا کے ہاتھ ہے یہ تو سہی
مظلوم بھی ہے داورِ محشر بھی ہے	ظالم نطعاً و سیفاً اب کہہ تو سہی

رباعی

جو معنیِ برجستہ ہیں سب بندھتے ہیں	جب بندھتے ہیں مضمون عجب بندھتے ہیں
ہیں کم سخن اس سے ہوں گو شیریں ہی کلام	کھلتی ہے اگر زبان تو لب بندھتے ہیں

رباعی

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو	یہ طائرِ جاں کی بیقراری سمجھو
ہے عمر بشر چند نفس کی میعاد	جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

رباعی

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے	اور طولِ امل فسوں و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے غصہ سے گریز	وہ خوک ہے اور یہ سگِ دیوانہ ہے

رباعی

رباعی

افلاس میں اسلاف کی عزت تو ہے
زر ہائے مگر گلوں میں نکہت تو ہے
ہر حال میں اخلاق کریمانہ رکھو
دولت تو نہیں رہی شرافت تو ہے

رباعی

دعویٰ ہم کو یہ ہے کہ لائق ہم ہیں
بے علم و کمال سب پہ فائق ہم ہیں
کہتی ہے مگر ہماری تن آسانی
خود اپنے لئے مانع و عائق ہم ہیں

رباعی

سودا ہے ہزار طرح کا سر ہے ایک
خطرے لاکھوں میں اور خاطر ہی ایک
حرص۔ آز حسد عُجب غضب جہل ہوس
سات رہزن ہے اور مسافر ہے ایک

رباعی

ظاہر میں تو خاطریں مداراتیں ہیں
دل میں بیٹھا ہی چور اور گھاتیں ہیں
باقی نہیں ہم میں اتفاق کلمہ
جتنے منہ ہیں بس اتنی ہی باتیں ہیں

رباعی

کچھ دخل کوئی فہم کو دیتا ہی نہیں
اب تک نافہمیوں سے چھٹتا ہی نہیں
ہر بات ہی تیری میری دیکھادیکھی
اب عقل سے کوئی کام لیتا ہی نہیں

رباعی

غافل ہیں ہمیں فکر پس و پیش نہیں
یعنی کہ مقدّر ہیں کم و بیش نہیں

سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہے آنکھ | اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

رباعی

ایسا بھی کہیں حد سے گذر جاتے ہیں | جو دل میں آ گئی وہ کر جاتے ہیں
اچھے نہیں اطوار ہمارے اے نظم | لوگ ایسے ہی جوان مر جاتے ہیں

رباعی

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں | پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آبِ شور ہے یہ دنیا | میں ڈوب کے مر گیا مگر پیاسا ہوں

رباعی

ہر عضو بدن نزع میں گھل جائے گا | یہ جسم کہیں خاک میں مل جائے گا
تا زیست تو کی ہے پردہ داری نظم | مرقد میں مگر خضاب کھل جائے گا

رباعی

میں تالبِ گور عمر بھر میں آیا | دم میرا لبوں پہ اس سفر میں آیا
اس طرح سے پیری نے مروڑا مجھکو | جو زلف میں خم تھا وہ کمر میں آیا

رباعی

جس کو نہ غم مآل اصلا ہوگا | پھر خاک اُسے اندیشۂ فردا ہوگا
کیفیت حال میں ہر اک شخص ہے مست | یہ فکر نہیں کسی کو اب کیا ہوگا

رباعی

گو اب نہیں مال و جاہ و دولت باقی
باقی ہے خدا اور اس کی رحمت باقی
سو مرتبہ ہو جائے زوالِ نعمت
سب کچھ باقی ہے گر ہے ہمت باقی

رباعی

کیوں سو رہے جاکے گور کی منزل میں
خالی تھی جگہ ان کے لئے تو دل میں
کچھ شعر لکھے تھے وہ سنائے اے نظم
افسوس کہ میکش نہیں اس محفل میں

تاریخیں

تہنیت عقد ثانی اعلحضرت خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

ہے آج جشن کہ سرکار عقد میں لائے
عروس آئینہ رخسار و ماہ سیما کو
زہے شکوہ سلیماں کو مل گئی بلقیس
زہے فروغ کہ یوسف ملا زلیخا کو
تو جاکے بزم میں اے نظم عقد کی تاریخ
یہ عرض کر کہ مبارک حضور والا کو
(۱۳۴۱ھ)

تاریخ تعمیر کتب خانہ آصفیہ

بنا نمود کتب خانہ آصف ہفتم
رساند ذروۂ اعلیٰ بہ اوج مریخش
نوشت نظم دعا گو چو دید بنایش
کہ ھٰذہ الکتب القیمہ ست تاریخش
(۱۳۴۹ھ)

تاریخ ترجمۂ وکار آف ویکفیلڈ

ترجمہ اردو میں انگریزی فسانہ کا ہوا
واقعی باتیں لباسِ داستاں پہنے ہوئے

ایک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی | ہے فرنگن زیورِ ہندوستان پہنے ہوئے
(۱۳۰۲ھ)

تاریخ طبع دیوان میرزا ذاکر حسین یاسؔ مرحوم

ہر شعر سے حسن خوش بیانی نکلے | ہر لفظ سے لطف نکتہ دانی نکلے
اے نظم چھپے نہیں یہ اشعار تمام | پتھر سے چشمۂ معانی نکلے
(۱۳۰۶ھ)

تاریخ ولادت نواب شہنواز جنگ بہادر

کیا ستارہ سا پسر حق نے دیا | حسن میں ہے غیرتِ ناہید یہ
دایہ سے حیرت میں ہاتف نے کہا | آگیا ہے گود میں خورشید یہ
(۱۳۱۲ھ)

تاریخ مثنوی ضیائے دکن

جناب مولوی باقر حسن نے | لکھے کیا پر ضیاؤ روشن اشعار
مضامین انکے سب ہیں دُرِ غلطاں | قلم کا ہے سوادِ ابرِ گہر بار
یہ شیرازہ ہے یا موتی گندھے ہیں | جُمل ہے عقد مروارید کا تار
ہوا ہے نظم یہ مصراع تاریخ | یہ سب اشعار ہیں لولوی شہوار
(۱۳۰۸ھ)

تاریخ دیوان حبیب کنتوری مرحوم

چھپ گیا کیا خوب دیوان حبیب | سب سخنور محوِ نظارہ ہوئے
نظم میں نے طبع کے گن کر سنین | لکھ دیا تیرہ سے اٹھارہ ہوئے
(۱۳۱۸ھ)

تاریخ دیوان نواب نبو صاحب رفعت مرحوم

فکر رفعت کی بلند اور طبیعت رنگین | کہنا اس طرح ہے قابو میں جسے کہتے ہیں

اونکے دیوان کی تاریخ یہ لکھی میں نے | سحر ایسا ہو اس اردو میں جسے کہتے ہیں (۱۳۰۰ھ)

مجھے ہمیشہ سے تاریخ کہنے سے انکار ہے تاریخ فن شعر میں داخل نہیں ہے مگر مجبور ہو کر کہہ بھی لیتا ہوں نواب عزیز یار جنگ بہادر مرزا داغ مرحوم کے ایک خوش فکر شاگرد ہیں میرے پاس آئے اور اپنے دیوان کی تاریخ کہنے کے لئے مجبور کیا میں نے یہ مصرع کہا :-

"داغ کا انداز اس دیوان میں ہے" (۱۳۲۶ھ)

تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم

بسکہ ہے آبستن[1] موت وحیات	حیف یہ عبرت کدہ ایرماں[2]
جو کوئی اس دار فنا سے گیا	پھر کے نہ آیا وہ کبھی پھر یہاں
اوٹھ گیا اس بزم سے حیف ایک امیر	باذل و ذی رتبہ و والا مکاں
رہ گیا نیکی کا زمانہ میں ذکر	مٹ گیا ایثار و کرم کا نشاں
غم سے برا حال ہے احباب کا	درد و الم دل میں ہے لب پر فغاں
تام بھی مرحوم کا تاریخ بھی	ہیں اسی اک بیت سے دونوں عیاں

معتمد الدولہ بہادر نے ہائے
کوچ کیا سوئے نعیم جناں (۱۳۲۸ھ)

[1] آبستن بمعنی حاملہ [2] ایرمان بمعنی عاریت ۱۲

تاریخ وفات علی فرزند سید محمد تقی صاحب

ماں باپ کی آنکھوں میں   تھی تیرہ و تاریک
ذی الحجہ کی تیرھویں   رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس اک سال   اور آٹھ مہینے
کیا گھر میں اُجالا تھا   طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اے نظم   فصلی ہے یہ تاریخ
اندھیرے دنیا میں   فرقت سے علی کی

(۱۲۴۰ – ۱۱۰)

تاریخ وفات استاذ علامہ جناب قائمۃ الدین رحمہ اللہ تعالیٰ

مَاتَ الفقیہُ الالمعی المقتدیٰ
وقد استباح الکنز مِنْ عُلیا التقیٰ
مذلم یزل للذین قائمۃ و رکن
للھدایۃ والزمان بہ اقتدیٰ
فنجوم اوجاتِ الشریعۃ قدھوت
وَسِرَاجُ اَنوَارِ الہدایۃ قدخبیٰ
ارّختُ عام الارتحال بمصرعٍ
لتزلزلت واللہِ ارکان الہدیٰ
(۱۲۹۸ھ)

تاریخ وفات سید بلگرامی مرحوم

ہوش نے رامپور سے لکھا | کہ ہے رنج و غم و الم کا ہجوم
ان کے والد نے انتقال کیا | اور تاریخ میں کروں مرقوم
پڑھ کے خط میں نے کہہ دیا دوبار | سید بلگرامی مرحوم

سہرا بتقریب عروسی آغا سید حسن اطال اللہ عمرہ

سر پہ نوشہ کے جو ہے در عدن کا سہرا | عکس سے لب کے بنا لعل یمن کا سہرا
سر پہ آنچل جو پڑا ہو گیا دونا جلوہ | کہ ہے سہرا یہ دوپٹہ کی کرن کا سہرا
دُرِ شہوار چمکتے ہیں ستاروں کی طرح | موتیوں کا ہے کہ پروین وپرن کا سہرا
چشمکیں کرتا ہے جب رخ پہ ستاروں کی کبھی | اور کبھی رنگ اڑاتا ہے چمن کا سہرا
سبز پٹی میں سورۂ اخلاص کی جا سورۂ نور | اک تجلی ہے رخ جلوہ فگن کا سہرا
کیا چمک طرۂ دستار پہ نوشہ کے ہے | جس سے شرما گیا گھونگٹ میں دلہن کا سہرا
یہ تجلی کسی نوشہ میں نہ دیکھی ہوگی | سر پہ خورشید کے جب ہے کرن کا سہرا
آئینہ بیچ میں دیکھا کیا یہ راز و نیاز | او لکھا نوشاہ کے طرہ میں دلہن کا سہرا
گل عارض کی صباحت کا مسلسل ہو جو ذکر | یہ غزل ہو گل نسرین و سمن کا سہرا
بار ور تو نے کیا نخل تمنا یارب | تو نے دکھلا دیا اس رشک چمن کا سہرا
جوہری نے بھی نئی اصطلاح پہ سوئے موتی | جس طرح نظم نے لکھا ہے حسن کا سہرا

عبارتِ خاتمہ

یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں میں خود سے کبھی غزل نہیں کہتا، ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ سے فضول سمجھتا ہوں غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک یکساں ہے، دیوان برسوں سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت اب آیا میں نے پھر سرے سے آخر تک ایک نظر ان غزلوں پر ڈالی اور اکثر مقاموں میں تغیر و تبدیل بھی کی ہے۔ میری اردو بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کردیں ان غزلوں میں جابجا معشوقانہ اداؤں کی تصویریں کھینچی ہوئی ہیں۔

خدا زاہد پرست و رہبان منش لوگوں کی نظر بد سے اس نگارستانِ معانی کو بچائے!

حوزۂ مقصوراتٌ فی الخیام کانھن اللولوٴ المکنون

جعلنا من ابکاراً عرباً اترابا

ڈیروں میں رہنے والی غزال چشم عورتیں (اعرابیہ بدویہ) گویا کہ وہ در مکنون ہیں ہم نے ان کو کواری چاہنے والی سہیلیاں بنایا ہے۔

علی حیدر طباطبائی

کتبہ محمد عبدالستار کاتب مکتبہ ابراہیمیہ

چند علمی کتابیں

مقدمات عبد الحق مولوی عبد الحق صاحب بی اے (علیگ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کو مقدمہ نویسی و دیباچہ نگاری میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ یہ مولانا کے کل مقدمات کا ایک بیش بہا گراں قدر اور نایاب مجموعہ ہے جس میں مذہب، فلسفہ، تاریخ و تذکرہ، زبان و ادب مختلف موضوعات پر وہ عالمانہ اور بسیط مقدمے ہیں جو اردو زبان کی متعدد بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ہیں اور جو بجائے خود بھی اپنے موضوع پر فاضلانہ مقالے ہیں قیمت حصہ اول (ہے) حصہ دوم (عاں)

مثنویات میر

مرتبہ مولوی سید محمد ایم اے یہ اردو شاعر کے سرتاج میر تقی میر کی جملہ مثنویات کا مجموعہ ہے جو متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے اور بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ترتیب دیا گیا ہے یہ مثنویاں اپنی اعلیٰ شعریت کی وجہ سے اردو ادب میں شاہکار ہیں مثنویات میر جامعہ عثمانیہ کے امتحان ایم اے اور دوسری جامعات کے اعلیٰ اردو نصاب میں شریک ہیں لائق مرتب نے بڑی صحت کے ساتھ مثنویاں ترتیب دینے کے علاوہ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے اور میر صاحب کی سوانح حیات ان کے کارناموں اور مثنویات پر بلند پایہ تعمیری تنقید بھی کی گئی ہے

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

غلطنامہ "صوت تغزل"



صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۴	فرد و بشر	فرد بشر
۴	۸	قیامت	قیامت
"	۱۲	سرخد	سرمد
"	۱۴	موبد	موبد
"	آخری خفی	دوانگلیال	دوانگلیاں
	پہلی سطر دوسری	لغت میں مؤید دونی طرح	لغت میں مؤید دونوں طرح
۵	۱۵	تعالی اللہ	تعالی اللہ
۶	۳	کہاں ہے	کہاں ہے
"	آخری خفی سطر	[illegible]	[illegible]

۱۴	۱۰	اس قدر لی چٹکیاں		اس قدر لیں چٹکیاں
۱۵	۱	ہوئی الجھن بڑا		ہوئی الجھن بڑھا
۱۷	۷	شُعاع		شعاع
۲۲	۴	دھوت		دھوپ
۲۸	۲	کب اُس		کب اِس
"	۷	(۱۷) ولہ	۱ ۱	(۱۷) ولہ ۱۱۹۱
۳۳	۱۲	نہں یک		نہیں اِک
۳۴	۳	ہئوا		ہوا
۳۵	۷	مٹھی		مٹی
۳۹	۱	×		فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات
"	۹	مجھ کو		تجھ کو
"	۱۲	جویارانہ		جو یارانہ
"	۱۵	دن چڑہا		دِن چڑھا
۴۱	۷	میں		ہیں
۴۳	۱۶	نازہے		نازسے
۴۵	۷	آہوں		آہو
"	۹	ڈھلنا		ڈھلتا

۴۵	۱۳	بھی نہ آئی	بھی آہی
"	۱۷	آئے	آکے
۴۶	۱۲	مورلغ	موزو ملغ
"	۱۴	حالم وجد	عالم وجد
۴۹	۴	مزا	مزا
"	۷	معز	مقر
۵۰	۵	ہوگا	ہوگیا
"	۱۴	نُطمہُ	لطمہُ
"	۱۵	نے لے	سے خضر لے
۵۱	۱۳	برق رہ گئی	برق بھی رہ گئی
۵۲	۱	گمئے	گئے
۵۵	۱۲	شبہُ	شبہہُ
"	۱۷	اژ دحام	ازدحام
۵۶	۱۲	بہ بزم جلوہ الخ	اگرچہ رخصت الخ
"	۱۳	اگرچہ رخصت الخ	ہوائے ابر الخ
"	۱۴	ہوائے ابر الخ	بہ بزم جلوہ الخ
۵۷	۶	سیما	مسیحا

۵۸	۷	قال		قابل	
"	۱۳	گیارا		گوارا	
۵۹	۱۵	مٹھکا		کھٹکا	
۶۰	۱۵/۱۶	حیف	بندہ	حیف	بندہ
۰	۰	حال	معلوم	حال	ق معلوم
۶۲	۱۴	کو		لو	
۶۳	۲	گرہ		گریہ	
"	۴	لیا		گیا	
۶۵	۱۴	کہ		کے	
۶۷	۲	یگایا		لگایا	
۷۰	۱۴	مشکے	بو	مشک بو	
۷۱	۱۴	بھلا		بہلا	
۷۲	۵	جوآبا		جواب آیا	
۷۶	۴	۳۷		۲۳	
"	۸	سرگہ		ہرکہ	
۷۷	۱۲	بگزوریم		بجزرم	
۷۹	۱			۶۰	۱۴

۷۹	۳	عشعش بیا مائم	عشقتش بیا سائم
"	۸	ہم ست	ہم است
۸۲	۴	لہ	کہ
"	۱۱	میست	نیست
"	۱۶	حکاتے	حکایتے
۸۴	۵	بال وپری	بال پری
"	۱۴	غرض	عرض
۸۵	۴	۱۹	۱۱
۸۶	۱	کیطرح زمیں	کیطرح وله زمین
۸۷	۲	دورباش	دورباش
"	۱۱	سوال	سوال
۸۸	۳	مشک وبو	مشک بو
۸۹	۵	آشتی	کشتی
"	۱۱	صد	پیر
۹۰	۹	دست ویا	دست وپا
"	۱۲	مائم	مائیم
"	"	ئ عمر	ما بہ عمر

۹۱	۱۵	نفس	نفس امارہ
۹۳	۵	تھی	تھے
〃	〃	حلاحل	جلاجل
۹۶	۷	لغنزش	لغزش
〃	۶	تیغزر	تعزیر
〃	〃	حسینونکے	حسینوں کے
۹۹	۹	پہُرا	پہرا
۹۹	۱۱	ڈھلجاتے	ڈھل جانے
۱۰۰	۵	ہیں	میں
۱۰۰	۶	افسانہ پہر	افسانہ پر
۱۰۰	۱۵	یانہیں	بانہیں
۱۰۲	۱۱	پروانہ	پروانوں
۱۰۴	۲	کہ سی	کہ اسے
〃	۶	آگے	آکے
۱۰۵	۱۴	پیرسر	تیر پر
۱۰۶	۱۳	آوازہ	آواز
〃	۴	ارسی	آرسی

۱۰۷	۹	صبرے	صبر نے
۱۱۶	۱	کہیں	کھلیں
"	۶	گرتاب	گرداب
۱۱۷	۱	میں بشر	میں ہے بشر
"	۱۷	گرساں لیطرف	گریباں کیطرف
۱۹	۶	ادھر	اُدھر
"	۱۶	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۲۰	۱	برزخ	برزخ
"	"	لکا	لگا
"	۴	پڑھ گئے	پڑ گئے
"	۱۷	رفتی	رُفتی
۱۲۱	۱۰	تشنہ یلیلا	تشنہ لبہا
"	۱۴	بکشم	بگشتم
۱۲۳	۹	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۳۱	۶	وسانپ	دو سانپ
"	"	تھائے	کھائے
"	۱۷	باندھے ہو	باندھے رہو

۱۴۵	۱۱	تحقق	تحقیق
"	۱۲	نشنریہ	نشتریہ
"	۱۶	کعبہ و نبر	کعبہ منبر
۱۴۷	۶	سکوسن	ساون
۱۴۸	۲	وہی حھلاسی کمری کی نہیں	وہی چھلاسی کمری کہ نہیں
"	۱۵	سنسان	سنسان
۱۴۹	۴	نگہ بار	نگہ یار
"	۱۶	فریادو	فریاد
۱۵۰	۳	ناقی	باقی
۱۵۱	۱۷	آرادانہ	آزادانہ
۱۵۲	۱	منت ہستی کو کیا	منت ہستی کیا
"	۶	کہ یہ	کہ یہ
"	۱۵	تو یہ	تو یہ
"	۱۶	ادا سمجھوے	ادا سمجھائے
"	۱۷	متجب	تعجب
"	"	تھر	پتھر
۱۵۴	۷	وہ ہر سو	کہ ہر سو

۱۵۵	۱۵	ہی ہی	رہی ہی
۱۵۶	۱۷	عبرت سے	ذرا عبرت سے
۱۵۷	۱	چپٹرہتے	چڑھتے
۱۶۱	۲	درو گوہر	زرو گوہر
"	۶	ہونکہ	ہوں کہ
"	۸	ٹہرائے	ٹھہرائے
۱۶۳	۵	درویش وعی	درویش وغنی
۱۶۴	۵	ھربدہ	عربدہ
۱۶۵	۸	ہوگہ	ہو گھر
۱۶۶	۳	مضر	مضر نہیں
۱۶۸	۱	ہلال برق	ہلال و برق
"	۱۱	ریک	ریگ
۱۷۲	۳	سنبرش	بہ بزمش
"	۱۵	میرے	میں ہے
۱۷۶	۱۵	یہی	یہی
۱۷۸	۱۶	خیربھی سے	خبر بھی ہے
۱۷۹	۱۱	دور سے	درو سے

۱۸۱	۱۱	رضع	رضیع
"	۱۴	متزبانے	میسانے
۱۸۵	۲	تری	تیرے
۱۸۷	۱	دود آعہ	دود آہ
"	۱۱	توڑتا	توڑنا
۱۸۸	۱۶	وہ	جو
۱۹۱	۶	حبص بیص	حیص بیص
"	۹	ہوئے	ہوائے
۱۹۲	۴	آزاد بھی	آزاد ابھی
۱۹۳	۱۶	کی مسافت	کی بھی مسافت
۱۹۵	۳	سدیروخورلق	سدیروخورنق
۲۰۰	۸	نگھ	نگہ
۲۰۵	۱۵	تیغ نو	تیغ تو
۲۰۹	۵	دمبالہ دار	دمبالہ دار
"	۱۰	بھی ہیں نشہ	بھی نشہ
"	۱۱	سلمنا	سامنا
۲۱۳	۱۰	بچلے	بچائے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱۴	۴	فراوانی	سلیمانی
۲۱۷	۱۶	مٹنے	ہٹنے
۲۱۸	۱۲	خودنمائی ہے کا	خودنمائی کا ہے
״	۱۶	نمایشرے	نمایش سے
۲۲۶	۱	دے کہ	دے کر
۲۲۸	۱	صدااالٹی	صداالٹی
۲۳۰	۹	چشم بز	چشم تر
۲۳۸	۸	کرہ	مگر
۲۳۹	۹	داد	داد لو
۲۴۴	۷	کرٹیں	کروٹیں
״	۸	لذت	صوت
۲۴۵	۱۷	مثل	مثل رقیب
۲۴۷	۷	لدورت	کدورت
۲۴۸	۹	سجرسے	سجھ سے
״	۱۳	نسر	سحر
۲۴۹	۳	کیا	کیسا
״	۸	وہ	جو

۲۴۹	۱۶	ستوں	کشتوں
"	۱۷	ہمیں	کہیں
۲۵۱	۳	چاکر	چاہ کر
۲۵۶	۱۰	شک	سنگ
"	۱۶	شک	اشک
۲۵۷	۹	تو	کو
۲۵۹	۱۵	اونگلیاں	اونگلیاں
۲۶۰	۵	پلنی	پلٹنے
۲۶۳	۱۰	دیکھی ہے	دیکھی جو ہے
۲۶۴	۱۳	حسن	حُسن
۲۶۵	۱۰	دل کو دہر	دل کو کہ دہر
۲۶۶	۱	بھی	بہی
۲۶۸	۴	سائگیتن	سانگیں
۲۷۲	۱۷	سیہ کاری	جفا کاری
۲۷۳	۲	سازی	ساری
"	۴	فلاف	ملاف
"	۱۰	زراز	راز

۲۷۳	۱۲	بیش		پیش
۲۷۶	۱۷	گرد باداوھ		گرد باداوٹھ
۲۷۷	۶	کی		کو
"	۹	ولہ		قطعہ
"	۱۴	زمیں		زمینیں
"	۱۷	نیساں		نیستاں
۲۷۸	۱	۲۱۰	۲۵	۲۱۰ — ولہ — ۲۵
۲۷۹	۹	جائے		جائیں
۲۸۱	۱۷	رنکھے		رکھے
۲۸۳	۱۷	بہتے		بہت سے
۲۸۴	۶	اُس یہ		اُس پہ
"	۱۷	ہے		تھے
۲۸۶	۱	۲۱۴	۱۳	۲۱۴ — ولہ — ۱۳
۲۸۷	۲	کہ ناصح		کہ کیوں ناصح
"	۵	کا		کو
"	۱۷	تغش		نقش
۲۸۹	۱	۲۱۶	۱۳	۲۱۶ — ولہ — ۱۳

۲۸۹	۱۷	کہا	کیا
〃	〃	ہنستا ہے پر اوپر سے	ہنستا ہے اوپر سے
۲۹۰	۱۱	متک	مہ تک
۲۹۱	۶	گتر	گر
〃	۱۱	اتنا ہو	اتنا تو
۳۰۰	۱۶	شوحی	شوخی
۳۰۵	۱۱	گلہ	گلا
۳۰۷	۸	پرواز	پرواز
〃	۱۴	دل بہ یار	دل بیمار
۳۱۲	۵	مثل	محفل
۳۱۷	۱۵	طبتم اخذتم علیہا اصری	لِبثتم اَخذتم علیہا اِصری

مطبع انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس